کانگو کے کنارے

آرزو چودھری



پرنٹرز اینڈ پبلیشرز کشمیر آرٹ پریس

کانگو کے کنارے

آرزو چوہدری

کانگو کے کنارے

نیا مکتبہ • مُلتان

بار اوّل ایک ہزار

قیمت :- تین روپے چار آنے

پرنٹرز اینڈ پبلشرز :- کشمیر آرٹ پریس پیسہ اخبار، لاہور

افسانے

انتساب

اسلم بھائی کے نام ——

جب ہوا نے سسکیاں بھریں
دھرتی کی گود میں پھول کملائے ——— اور
اس نے ۱۰ محرم الحرام سنہ ۱۳۷۴ھ (۹۔۹۔۵۴) کو
چند بے رحم ہاتھوں مضروب ہو کر انیسویں بہار میں
آنکھیں بند کر لیں ——— وہ اس پار
چلا گیا ——— زندگی کے دوسرے کنارے ———
دوسرے کنارے پر کیا ہے ——— ؟؟
کوئی نہیں جانتا ——— درمیان میں ظالم موت
کی گہرائیاں حائل ہیں ——— ایک مکمل ظلمات ——!!

پھر کس لئے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

پیش لفظ

آرزو نے عریاں نگاری جیسے " ہنستے اور چلتے " ہوئے نسخہ پر عمل پذیر نہ ہوتے ہوئے اچانک اور فوری طور پر " نام پانے سے " تو یقیناً احتراز کیا ہے۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں قلم ذرا بہک چلا ہے —— بیشتر نسائی کردار عملی طور پر " محبت اور لباس " میں کچھ فرق روا نہیں رکھتے۔ یہ کردار محبت کے معاملے میں بھی اسی طرح تنوع اور تبدیلی چاہتے ہیں جس طرح انسان لباس میں یا بھونرا کلیوں میں —— مصنّف کا یہ مشاہدہ ہو یا تجربہ آجکل کی عام نسائیت کا ہے۔ بہرحال یہ ایک تلخ مگر صحیح رُخ —— مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم " ٹوٹی چوڑیاں " میں دلہن جیسی شفیق، غمگسار، وسیع ظرف اور دلآویز محبوبہ ہستی سے دوچار ہوتے ہیں، جس کی پاکیزہ معصومیت اور معصوم پاکیزگی کے زیرِ سایہ آکر نازلی اور زندگی سے ہارا ہوا مایوس و دلگیر کامران سکون و طمانیت پاتا اور تازہ ولولوں اور امنگوں کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ سہاگ رات کو عروسِ نو کے سامنے کامران کی صاف گوئی، اپنے ماضی کا انکشاف اور مداوے کی نیت سے اپنی دلہن کے صحیح

جذبات واحساسات کے متعلق استفسار اور اس کے جواب میں دلہن کا والہانہ مگر خاموش طرزِ عمل سے بغایت خلوص، پاکیزگی، اپنائیت اور دلدہی کا اظہار —— مجموعہ کا یہ بہترین افسانہ ہے۔

دو تاریخی افسانے "ہیرا بائی" اور "بیوہ سہاگن" بھی شامل ہیں۔ اورنگ زیب جیسے خشک پارسا اور سپاہی قسم کے آدمی کے پہلے مگر آخری حقیقی روماں سے بہت کم لوگ واقف ہونگے۔ ہیرا بائی میں اس مردِ فقیر کا یہ رُخ بھی دلآویز اور روماں انگیز پیرائے میں موجود ہے ہیرا کو دیکھ کر بابری سپوت کی بے ہوشی —— الف لیلیٰ کے شہزادوں والی بات ہو گئی —— اچھا ہوتا اگر افسانہ نگار جادو ناتھ سرکار کے علاوہ دیگر معقول مورخین کو بھی پیشِ نظر رکھ کر اورنگ زیب کی غشی کی تصدیق یا تردید کر لیتے۔

جنگلی کے نام سے آرزو ایک دلچسپ اور رومانی ناول لکھ رہے ہیں۔ "ناگپاں" اسی کا ایک باب ہے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ سفید سانپ کی یہ عجیب و غریب خصوصیات مبنی بر حقیقت ہیں یا مصنف کے اپنے دماغ کی اُپج۔ جو کچھ بھی ہو ایک طبقہ کیلئے یہ چیز ہے دلچسپ۔

"کانگو کے کنارے" —— افریقہ کی پُراسرار سرزمین، گھنے و پُرخطر جنگلات، چودہویں رات میں مسحور کن ہنگروں ناچ۔ خونیں رقابت، ایک کی نہ ہو کر رہنے والی بنتِ کانگو —— سومی —— کی حرماں نصیبی —— عمدہ افسانہ ہے۔

بحیثیت مجموعی آرزو کی اولین کوشش خاصی کامیاب ہے —— تیور بتلا رہے ہیں کہ چل نکلینگے

ابنِ حنیف

۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۵۴ء

ناگپال

ٹمٹماتے ہوئے تاروں کے جھمگٹ میں چاند اس طرح چمک رہا تھا جیسے کوئی
بے وفا حسینہ سُرمئی بادلوں کے سایے میں بام پر کھڑی ہے اور اس نے اپنے منہ
کو سلمہ ستارے جڑی، ململ کی مہین چُنری سے ڈھانپ رکھا ہے۔

چکور محوِ پرواز تھا اور کرنیں اس پہ نثار ہوتی جا رہی تھیں۔

زیدی تفکرات کی دُنیا میں کھویا ہوا بستی کی تنگ پگڈنڈیوں پہ ٹہل رہا تھا پیٹھ
پر ہاتھ رکھے ہوئے وہ کبھی آگے بڑھ جاتا اور کبھی واپس پلٹ آتا تھا۔ چاروں طرف
خاموش چاندنی سو رہی تھی کہ زیدی کے کانوں میں بین کی آواز آئی۔ دور کوئی مدھ بھرے
نغمے جنگل میں بکھیر رہا تھا۔ زیدی نے نگاہ اُٹھائی، سامنے دوڑتی ہوئی تنگ
پگڈنڈیوں اور ان کے اختتام پر سوئے ہوئے درختوں کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا
بین کی آواز ہر لمحہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اور فرشتے چندا کی نور بھری کشتی میں حوروں

کو جھٹلائے۔ ستاروں سے آگے جہاں کی تلاش میں اسے کھیہ رہے تھے۔ حوریں مسکرا رہی تھیں۔ اور فرشتے آسمان کے سینے پر تیرتے ہوئے تاروں کے موتی اٹھا اٹھا کر ان کی جھولیاں بھر رہے تھے۔

بین کی آواز قریب ہی سنائی دینے لگی۔ اور ایک شخص بین بجاتا ہوا درختوں میں سے نمودار ہوا۔ اس کے منہ سے لگی ہوئی بین رو رہی تھی۔ اور اس کا رونا دلوں میں درد پیدا کر رہا تھا۔ وہ اپنے گالوں کو پھلائے تنگ پگڈنڈی پر ناگ کی مانند چلا آ رہا تھا۔ اور چندا کی کنواری کرنیں اس کے قدموں میں بچھی جا رہی تھیں۔

"سولا بستی یہی ہے نا" نووارد شخص نے اپنے منہ سے بین ہٹا کر سلام کرتے ہوئے زیدی سے پوچھا۔

"ہوں"

"صاب۔ یہ سولا بستی ہے نا" نووارد شخص نے اپنے الفاظ دہرائے۔

"ہاں ہاں۔ سولا بستی یہی ہے"۔

"میں مسافر ہوں رات کاٹنا چاہتا ہوں"۔

"بڑے شوق سے ——— ہمارے ساتھ ہی پڑ رہنا" زیدی نے جواب دیا اور نووارد جوان نے اپنے کاندھے کے پیچھے پڑے ہوئے پٹارے اتار کر زمین پر رکھ دئے۔

"ان میں کیا ہے"؟

"ناگ ہیں سرکار!"

"ناگ؟"

"جی ہاں - میں ناگپال ہوں - بستی بستی گھومتا ہوں - نیتا کے مرنے کے بعد میرے لئے یہی کام رہ گیا ہے —— بڑے ہی خطرناک ناگ ہیں - دکھاؤں صاب -"

"اب نہیں - صبح دکھلانا" زیدی نے ٹالنے کی غرض سے کہا -

"صبح کیا مزہ آئے گا - ناگپال بیٹھ گیا - اب دیکھئے - چاندنی رات ہے - اور ناگن چاندنی رات میں مست ہوجایا کرتی ہے سرکار —— میرے پاس جوڑا نہیں ورنہ پھر دیکھئے کہ یہ زہریلے جانور کتنا پیار کرتے ہیں آپس میں" ناگپال نے پٹاروں کو اُٹھا کر اپنے قریب رکھ لیا۔

"تم تھکے ہوئے ہو گے ناگپال"

"میں تھکا ہوا ہوں گا —— کیا کہہ دیا سرکار - ہمارا تو کام ہی یہی ہے - دن رات گھومتے ہیں اور آپ جیسے لوگوں کی سیوا کرتے ہیں -" نوجوان ناگپال نے مسکرا کر اپنے ماتھے پر پڑے ہوئے گھنگھریلے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے سر پہ ہاتھ پھیرا - اور اپنے ڈھیلے ڈھالے پیوند لگے ہوئے کُرتے کی جیب سے میلا سا رومال نکال کر سر پر باندھ لیا —— رومال باندھنے کے بعد ناگپال نے باری باری اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا - اور برابر رکھی ہوئی بین اُٹھا کر منہ سے لگالی - بین آہستہ آہستہ بجنے لگی - ناگپال کے دونوں گال پھول کر کپا ہو گئے - اس کی انگلیاں بین پر ناچ رہی تھیں -

ناگپال نے بین پر سے ایک ہاتھ اُٹھا کر پٹارہ کھولا - اور پھر جلدی سے اپنا ہاتھ سمیٹ کر بین پر رکھ لیا - پٹارہ کے منہ پر سے ڈھکنے کے ہٹتے ہی سفید رنگ

کا پتلا سا سانپ پھنکارے مارتا ہوا فٹ بھر پٹارے سے اونچا کھڑا ہو گیا۔ اس نے پہلے پٹارے کے اندر ہی چاروں طرف چکر لگایا۔ اور ناگپال کی طرف منہ کر کے اپنی پتلی پتلی زبانوں کو جلدی جلدی نکالتے ہوئے چندا کی نورانی کرنوں میں جھومنے لگا۔

چاند کی کومل کرنیں گلے ملتی ہوئی دنیا والوں کو درسِ محبت دے رہی تھیں اور ناگپال زمین پر بیٹھا بین کو تھپکیاں دے دے کر انہیں سلا رہا تھا۔ زیدی گم صم بت بنا دیکھ رہا تھا۔ ناگپال سانپ کے ساتھ ساتھ خود بھی مست ہوا جا رہا تھا۔ اور بین کو چھیڑ چھیڑ کر سانپ پر بھی جادو کر رہا تھا۔ سانپ ناگپال کے اشارے پر آگے پیچھے دائیں، بائیں جھول رہا تھا۔ اور ناگپال جھوم جھوم کر اپنا سر ہلا رہا تھا۔

"ونود!" زیدی نے اپنے کاندھے پر ونود کے ہاتھ کو محسوس کرتے ہوئے گھوم کر دیکھا۔

"ہاں بھیا۔ آنکھ کھل گئی۔ کمبخت نے آتے ہی پھیکی چاندنی میں جان ڈال دی زیدی اور ونود کی نگاہیں کبھی سپیرے پر پڑتی تھیں۔ اور کبھی سانپ پر۔ فضا چپ چاپ تھی۔ اور آسمان کی کھلی چھاتی پر چاند دمک رہا تھا۔

بین کی رسیلی آواز بستی کی جھونپڑیوں سے کوئی کوئی خوبصورت بھجن لگنے لگی۔ ناگپال نے بین بجاتے بجاتے یکلخت بند کر دی۔ جھومتا ہوا سانپ ٹھہر کر پھنکارے مارنے لگا۔ ناگپال نے جلدی سے پٹارہ کا ڈھکنا اٹھا کر آہستہ سے سانپ کے سر پر مارا۔ سانپ پھنکار کر نیچے بیٹھ گیا۔ اور ناگپال نے پٹارہ

کے منہ پر ڈھکنا رکھ دیا۔ بین کی محبوب آواز کی جدائی پر سانپ پھنکارتا ہوا اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگا۔ اور پھر ہار کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

دیکھا صاب ——— یہ ناگوں کی محبوبہ ہے۔ بہت کم ملتی ہے یہاں ——
صرف ریگستانی علاقوں میں جہاں ریت کے ان گنت ٹیلے دور دور تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں کہیں کہیں ملتی ہے۔ اسے ٹھنڈا ٹھنڈا ریت بہت پسند ہے جب چاند پورا ہوتا ہے یہ اپنے بل سے نکلتی ہے۔ اور ریت پر کھیلتی ہے۔ اکثر نر اور مادہ دونوں ہی اکٹھے ہوتے ہیں۔ دونوں رات بھر آپس میں کھیلتے ہیں۔ لڑتے ہیں۔ اور ریت پر لوٹتے ہیں ——— ریت کے ٹیلے کی چوٹی پر دونوں گرتے پڑتے چڑھ جاتے ہیں۔ اور پھر اوپر سے گیند کی طرح لڑھکتے ہوئے نیچے آتے ہیں۔ اسی طرح ہنستے کھیلتے رات بیت جاتی ہے۔ چاند زمین کی طرف جھکتا ہے۔ اور یہ دونوں دوڑ کر اپنے بل میں گھس جاتے ہیں۔ پھر اسی طرح رات کو نکلتے ہیں۔ اور کھیلتے ہیں۔

سرکار آپ کو تعجب ہوگا یہ جتنا خوبصورت ہے اتنا ہی خطرناک ہے۔ ناگپال زمین پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ زیدی اور ونود سُن رہے تھے۔

اول تو یہ جوڑا ملتا ہی مشکل سے ہے۔ اور اگر مل بھی جائے تو قابو میں نہیں آتا۔ یہ جس علاقے میں ہوتا ہے اس کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ چاندنی راتوں میں مرد یا عورت تو کیا کوئی جاندار بھی وہاں سے گزر نہیں سکتا۔ اگر کوئی قسمت کا مارا بھولا بھٹکا وہاں جا بھی نکلے تو زندہ نہیں بچ سکتا۔ ان کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے اور چال تو کچھ پوچھئے نہیں۔ گھوڑے کو بھی مات کھانی پڑتی ہے۔ جاندار کو دیکھتے ہی فوراً ڈس لیتا ہے۔ ان کا جانی دشمن

اور اس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔ اسی وقت دم توڑ دیتا ہے۔ آپ اس جوڑے کی ہر بات انوکھی ہی پائیں گے۔ اس کے کاٹنے کا ڈھنگ بھی نرالا ہے۔ ناگ انسان کو دیکھ کر اس پر جھپٹتا ہے۔ اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر اسے زمین پر گرا دیتا ہے۔ صاحب دیکھنے کو تو پتلا سا ہے مگر فولاد کی زنجیروں سے زیادہ مضبوط ہے۔" ناگپال اصل بات چھوڑ کر پٹارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "جس وقت انسان زمین پر گر جاتا ہے۔ یہ نامراد اس کے گرتے ہی دوڑتی ہوئی آتی ہے۔ اور اس کے ہونٹوں کو اپنے منہ میں لے کر خوب چباتی ہے۔ خون کے چند قطرے نمودار ہوتے ہیں اور انسان اسی وقت نیلا پڑ جاتا ہے۔ اس کے بعد نر ٹانگوں سے جدا ہو کر مردہ انسان کے گرد کئی چکر لگاتا ہے۔ اور پھنکار پھنکار کر اس کے جسم کو جگہ جگہ ڈنک مارتا ہے۔ پھر دونوں اچھلتے کودتے دوڑ جاتے ہیں۔ اور اپنے کھیل میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

"یہ ناگن ہتنی سی، بہت ہی خطرناک ہے" ناگپال نے پھر پٹارہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور بولا "مجھے افسوس بہت ہے۔ کہ ناگ میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اگر وہ بھی میرے ہاتھ آ جاتا۔ تو آج میں بادشاہ ہوتا۔ کسی ناگپال کو مجھ سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوتی۔ خیر۔ اب بھی میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ سوائے میرے کسی کے پاس اس قسم کا سانپ نہیں۔ میرے قبیلے والوں نے مجھے بھاری بھاری رقمیں پیش کیں۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ کئی شخصوں نے تو مجھے اپنی بیٹیاں بھی دینی چاہیں۔ مگر میں تیار نہ ہوا۔ یہ سب اسی ناگن کی کرامات ہیں۔ کیوں نہ ہوں؟ آخر میں نے بھی تو اسے اپنی جان پر کھیل کر پکڑا ہے۔ سرکار بڑی

مشکلوں سے قابو میں آئی ہے۔ یہ تو میری ہی ہمت تھی جو میں نے اسے پکڑ لیا۔ ورنہ دوسروں کے قابو کہاں آسکتی ہے یہ۔ میرے کئی ساتھیوں نے اس جوڑے کو پکڑنے کے لئے ان پر ہاتھ ڈالا۔ مگر افسوس بچارے ان موذیوں کی مار سے نہ بچ سکے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گئے۔

بہت سے ناگپال ناگ تو ضرور رکھتے ہیں۔ اور پالتے بھی ہیں۔ مگر ان ناگوں کی چالاکیوں کو نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہوتی ہے۔ کہ وہ بعض اوقات ان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ اور اپنی جانیں مفت میں کھو دیتے ہیں۔ اور یہ سفید جوڑا تو بس۔ یہ تو بہت ہی چالاک ہوتا ہے۔ ناگن بین کی آواز پر فوراً مست ہو جاتی ہے اور بین کی آواز سنتے ہی اپنے ساتھی کو اکیلا چھوڑ کر اس کی طرف دوڑتی ہے۔ اس سے ناگ کو بہت غصہ آتا ہے۔ اور وہ رقابت کے مارے بین بجانے والے کو پیچھے سے آکر ڈس لیتا ہے۔ میرے ساتھی بھی بچارے اسی طرح مارے گئے۔ انہوں نے بین بجائی اور ناگن جھومتی ہوئی آئی۔ وہ اپنی کامیابی پر خوش تھے۔ اور بڑھ بڑھ کر بین بجا رہے تھے۔ ناگن ان کے سامنے ناچ رہی تھی۔ اور وہ ناگن کا ناچ دیکھ دیکھ کر بین بجاتے ہوئے اپنے آپ سے بے خبر ہو رہے تھے کہ موذی نر پیچھے سے آیا۔ اور باری باری تینوں کو ڈس لیا۔ تین ناگپالوں کی ایک ساتھ موت بڑی ہی دردناک تھی۔ بستی بھر میں کہرام مچ گیا۔ اور کئی دنوں تک اس بات کا چرچا رہا۔ آس پاس کے لوگوں میں دہشت پھیل گئی۔ رات تو رات دن میں بھی لوگ ادھر جاتے ہوئے ڈرنے لگے۔

میرے نوجوان ساتھیوں کی موت کے بعد کسی ناگپال کو اس جوڑے پر

دیتا۔ کہ اگر رُک گیا۔ تو میرا بھی وہی حشر ہوگا۔ جو میرے ساتھیوں کا ہوا۔ بڑی الجھن درپیش تھی۔ کئی دن اسی شش و پنج میں گزر گئے۔

آخر ایک رات جب چاند پورا تھا۔ میں ہمت کر کے بستی سے نکلا۔ نتھری ہوئی چاندنی چاروں طرف چھپی ہوئی تھی۔ دنیا آرام سے سو رہی تھی۔ میں ہمت کر کے گھر سے نکل آیا۔ اور بستی کو پار کر کے ٹیلوں کے سامنے پہنچا۔ دور دور تک چھوٹے بڑے ٹیلے پھیلے ہوئے تھے۔ ہُو کا عالم تھا۔ نہ آدم اور نہ آدم زاد ــــ خاموش کرنیں بھی مجھے ڈرانے لگیں۔ میرے پاؤں نے جواب دے دیا۔ میں مجبور تھا۔ لاچار واپس آگیا۔ یقین جانئے۔ جس وقت میں اپنے بستر پر پڑا۔ اس وقت بھی میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے بعد میری ہمت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ جہاں اس جوڑے کا ذکر ہوتا۔ میں وہاں ٹھہرتا بھی نہ تھا۔ اسی طرح ایک ماہ کے قریب گذر گیا۔ اور بات بھی آئی گئی ہوگئی۔

ایک رات میں جھونپڑی کے باہر بیٹھا بین کو دیکھ رہا تھا۔ کہ نیتا میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ نیتا ہمارے قبیلے کی ایک لڑکی تھی۔ سانولی سی۔ اب تو بےچاری مرگئی۔ میں نے اچانک نگاہ اٹھائی تو دیکھا۔ نیتا کھڑی مجھے گھور رہی ہے۔ اور بیل کے پتوں میں سے چاندنی چھن چھن کر اس کے منہ پر پڑ رہی ہے۔

"نیتا تم ـــ"

"ہاں ـــ"

"کیسے تکلیف کی؟"

"بہت بھولے ہو نا"

"میں تو خیر بھولا ہوں، لیکن تم ....."

"مانو۔ کیوں زخموں پر نمک چھڑکا کرتے ہو" یہ کہہ کر نیتا میرے برابر بیٹھ گئی۔ اور میں تھوڑا سا کھسک گیا۔

"بہت ہی سنگدل ہو"

"تو کیا خیال ہے۔ تمہاری طرح موم بن جاؤں" یہ کہہ کر میں نے اٹھنا چاہا لیکن نیتا نے میرا کرتہ پکڑ لیا۔ اور مجھے زبردستی بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

"میری غلطیوں کو معاف کر دو! مانو" وہ گڑگڑا کر بولی

"نیتا"

"ہاں" اس نے ہاں کہہ کر میری طرف دیکھا۔ چاند کی کرنیں اس کی سیاہ آنکھوں پر پڑ رہی تھیں۔

"تم مجھے معاف کر دو۔ تو کیا ہی اچھا ہو"

"مانو" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی"

"نیتا یہ تمہارا خیال ہے۔ کوئی کسی کے لئے نہیں مرتا"

"یقین کرو۔"

"سنتا تو بہت ہوں۔ لیکن دیکھا کسی کو نہیں"

"دیکھ لوگے کسی دن"

"اچھا اب میں جاتا ہوں"

"کہاں جاؤ گے؟"

"کہیں جاؤں۔ نہیں کیا؟"

"مانو۔" وہ میری ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر میرے پاؤں پر گر رہے تھے۔

"عجیب عورت ہو۔"

"میرا دل میرے ہاتھ میں نہیں"

"تو بس یہ سمجھ لو۔ میں بھی مجبور ہوں۔"

"کیا مجبوری ہے۔ مجھے بتلاؤ تو سہی۔" وہ میری ٹانگوں کو چھوڑ کر کھڑی ہو گئی

"ہے کوئی مجبوری"

"مانو رحم کرو۔"

"رحم" اتنا کہہ کر میں مسکرایا اور وہ مجھے جھنجھوڑ کر بولی

"ہنستے ہو۔ کسی دن روؤ گے بھی"۔

"تمہارے لئے روؤں گا۔"

"مانو۔" وہ پھر میرے قدموں پر گر پڑی اور زار زار رونے لگی۔

"نیتا۔ پاگل نہ بنو۔"

"یہ میرے بس میں نہیں"

"تو تمہارے اختیار میں کیا ہے۔ لوگوں کے دلوں سے کھیلنا۔"

"نہیں مانو نہیں۔" وہ اپنا منہ میرے پاؤں پر رگڑنے لگی۔

"جاؤ۔ یہاں سے۔ مکار۔" میں نے جھٹکا مار کر اپنا پاؤں کھینچ لیا۔ وہ گر پڑی۔ اور اس نے جلدی سے کھڑے ہو کر میرا گریبان پکڑ لیا۔

"ہٹو بھی۔"

"نہیں نہیں۔ مانو نہیں" میرے کہنے پر اس نے اپنی مٹھیاں اور زور سے بھینچ لیں

"نیتا زیادہ تنگ کرو گی تو میں گلا گھونٹ دوں گا"

"ابھی گھونٹ دو۔ مجھے خوشی ہو گی۔"

"خوشی ہو گی؟"

"ہاں مانو میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" اس نے میرا گریبان چھوڑ دیا۔ اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"اس وہم کو نکال دو اپنے دماغ سے"

"وہم نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا اچھا دماغ نہ کھا میرا۔" اتنا کہہ کر میں بین اُٹھانے کے لئے جھکا۔ لیکن اس نے جلدی سے بین اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لی

"لاؤ بین۔"

"نہیں دوں گی۔" "نیتا" "اوں ہوں" اس نے گردن ہلا دی

"اچھا تو رکھو سنبھال کر۔" میں نیتا کو وہیں چھوڑ کر اپنی جھونپڑی میں آگیا۔ اور دروازہ بند کر لیا۔ دوسرے دن صبح اٹھ کر میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا — نیتا بین لئے کھڑی ہے۔

"تم"

"مانو۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"بہت سمجھ چکا ہوں - اب زیادہ پڑھانے کی ضرورت نہیں۔"

"اچھا - تمہاری مرضی۔" وہ میرے ہاتھ میں بین تھما کر سر کو جھٹکاتے چلی گئی - اس کے بعد وہ کئی دن تک دکھائی نہ دی - میں نے سوچا کہ چلو چھٹکارہ ہوا۔ ایک رات پچھلے پہر میری آنکھ کھل گئی - لاکھ کوشش کرنے پر بھی میں سو نہ سکا۔ چارپائی پر پڑے پڑے میرے پہلو سلگ اٹھے - مجبوراً میں اٹھا۔ تھیلے میں سے بین نکالی - اور جھونپڑی سے نکل کر سیدھا پیپل کے نیچے پہنچا۔ تارے نکلے ہوئے تھے۔ رات اوداس تھی - میں پیپل کے درخت سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ اور آہستہ آہستہ بین بجانے لگا۔ ابھی بین بجاتے ہوئے مجھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی - کہ کسی نے پیچھے سے آکر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا - میں نے بین بند کر دی

"بجاؤ - ماتو - ٹھہر کیوں گئے؟"

"کون - نیتنا -" میں نے اسے پہچان لیا۔

"نیتنا نہیں - میری نیتنا۔" وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری گود میں رکھے - اور اس کے بعد خود بھی گر پڑی۔

"ناراض ہو گئے ماتو؟"

"نہیں تو -" میں نے اٹھنے کی کوشش کی

"بیٹھے رہو -" اس نے اپنے جسم کا دباؤ دیا۔

"نیتنا -"

"جی -"

"تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا -"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں تو اتنا چاہتی ہوں۔ کہ تم مجھ سے ناراض نہ رہا کرو" وہ میری گود میں پڑی رہی اور میں کچھ نہ بولا۔

"مانو" تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی بولی۔

"کیوں؟"

"اس طرح تو نہ بولو"

"عجب مصیبت میں پھنس گیا ہوں"

"مصیبت نہیں۔ میرے مانو" اس نے گود میں سے اپنا سر اٹھا لیا اور اچک کر میرے لبوں سے اپنے لب ملا دئے۔

"نیستا"

"بس مالک"

"یہی چاہتی تھی نا"

"ناراض ہو گئے" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گالوں سے رگڑنے لگی۔

"نیستا! انسان کو ہرجائی نہیں ہونا چاہیئے"

"مجھے معاف کر دو۔ غلطی انسان سے ہو ہی جایا کرتی ہے"

"میں اس چیز کے خلاف ہوں"

"مجھ سے بھول ہو گئی" وہ پھر میری گود میں گر گئی۔

دن کی روشنی پھوٹنے لگی پیپل کی ٹہنیوں پر اونگھتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پرندوں نے اپنی چونچیں کھولیں اور پروں کو پھڑپھڑایا۔

"بس اب جاؤ"

"تھوڑی سی دیر اور۔"

"نیستا۔" میرے اونچا بولنے پر وہ سہم سی گئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تمہارا دل پتھر ہے۔"

"اب تم جا سکتی ہو۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ میری طرف دیکھتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ سورج کی پیلی پیلی کرنیں پیپل کی چوٹی پر کھیلنے لگیں۔ میں وہاں سے اٹھا اور تمام دن ادھر اُدھر پھر کر گزارا۔ رات کے سائے جب پھیل گئے۔ تو میں اپنی بین لے کر اسی پیپل کے نیچے آ بیٹھا۔ مجھے بیٹھے ہوئے ابھی تقریباً آدھ گھنٹہ ہی گزرا ہوگا۔ کہ نیستا ایک طرف سے نمودار ہوئی۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی اور آ کر مجھ سے لپٹ گئی

"نیستا۔"

"مالو" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

"کیا بات ہے؟" وہ کچھ نہ بولی۔

"ارے منہ سے تو کچھ کہو۔"

"تم وہاں نہ جاؤ۔" بار بار پوچھنے پر وہ روتے ہوئے بولی

"کہاں نہ جاؤں" ۔ میں نے بازوؤں سے پکڑ کر اسے بٹھلا دیا

"سفید ناگوں کے پاس"

"سفید ناگ۔"

"ہاں" سفید ناگوں کا نام لینے سے میرے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی

"تم وہاں ضرور جاؤ گے؟" وہ بچوں کی طرح مچل کر بولی۔

"نہیں۔ تمہیں کس نے کہہ دیا۔"

"لالو کے جھونپڑے کے سامنے باتیں ہو رہی تھیں"

"ویسے ہی کہہ رہے ہوں گے"

"مجھے دھوکہ نہ دو ماتو"

"نیتا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔

"مجھے نہ چھوڑو۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔
تم گھر جاؤ"

"نہیں میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتی"

"نیتا" میں نے غصے میں آکر کہا

"آج کچھ بھی کہو۔ میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گی"

"تم کون ہوتی ہو۔ مجھے روکنے والی" میں جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میرے پاؤں سے لپٹ گئی
"ماتو"

"چھوڑو بھی" میں زبردستی اپنا پاؤں چھڑا کر اپنی جھونپڑی میں آگیا اور اندر سے کنڈی لگالی۔
سفید سانپوں کے جوڑے کے بارے میں مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ لیکن آج نیتا کے کہنے پر میرے
دل میں پھر خواہش جاگ اٹھی۔ اور رہ رہ کے مجھے ان کا خیال آنے لگا۔ نیتا کے دل میں
آگ لگانے کے لیے میں نے اس جگہ جانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

"سرکار، ہماری عورتیں بھی بڑی ہوشیار ہوتی ہیں" ناگپال نے زیدی کی طرف پھر دیکھا۔
اور کہنے لگا "ناگ اور سانپوں سے بالکل نہیں ڈرتیں۔ ہماری غیر موجودگی میں گھر کے کام دھندوں
کے علاوہ پٹاروں میں بند سانپوں کی دیکھ بھال بھی وہی کرتی ہیں۔ اکثر عورتیں تو سانپوں کو پکڑ بھی
لیتی ہیں۔ اور وقت پڑنے پر مار بھی دیتی ہیں۔ نیتا جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں زیادہ خوبصورت

نہیں تھی۔ لیکن اتنی بری بھی نہیں تھی۔ کہ انسان اس سے نفرت ہی کرنے لگ جائے۔ نیستا سانولے سلونے رنگ کی لڑکی، کئی نوجوانوں سے آنکھ مچولی کھیل چکی تھی۔ میں جانتا تھا۔ خبر نہیں کیا بات ہوئی مجھے چاہنے لگی۔ مجھے اس سے محبت تو نہیں تھی۔ ہاں وہ اچھی ضرور لگتی تھی۔ اور اس کا میرے پیچھے پیچھے پھرتے رہنا مجھے پسند تھا۔ میں راتوں کو بین بجایا کرتا تھا۔ اور وہ چھپ چھپ کر ناگن کی طرح میرے آس پاس پھرا کرتی۔ اور بعض دفعہ تو میرے پیچھے پیچھے دور تک نکل جاتی تھی۔ اسے مجھ سے بے حد محبت تھی۔ لیکن میں نے اسے دل سے کبھی نہیں چاہا۔ اب میں بہت پچھتا رہا ہوں۔ اور وہ مجھے بھیگی بھیگی راتوں میں بہت ہی یاد آتی ہے۔ ناگپال کی آواز بھرا گئی۔ اور چند منٹ خاموش رہ کر بولا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ نیستا کے ذکر کرنے پر میرے دل میں پھر لگن پیدا ہو گئی۔ ایک رات چاند نکلا۔ چاند کچھ کچھ اداس تھا۔ لیکن میں نے پرواہ نہ کی۔ خالی پٹاروں کی ہلکی سی گٹھڑی باندھ کر میں نے کاندھے کے پیچھے ڈال لی۔ اور بین ہاتھ میں لے کر چھپتا چھپاتا بستی سے نکلا۔ بستی سے باہر نکلنے کے بعد میں نے بین منہ سے لگائی۔ اور اسے بجاتا ہوا چل دیا۔ تمام لوگ سو چکے تھے۔ میرے چاروں طرف دور دور تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور میں بین کی آواز کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ بستی سے کچھ دور نکلنے کے بعد ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے شروع ہو گئے۔ اور میں بین بجاتا ہوا ان ٹیلوں کو روندتا ہوا بے دھڑک گزرتا گیا۔ میں اور چاند اکٹھے آگے بڑھ رہے تھے۔ کہ سامنے وہی اونچا ٹیلہ نظر آیا۔ جس پہ یہ جوڑا اکثر کھیلا کرتا تھا۔ وہ چاندنی راتیں آپس میں چھیڑ چھاڑ کر کے گزارا کرتا تھا۔ بین کی آواز خود بخود میرے قدموں کو اٹھا رہی تھی۔ میں اور میرا سایہ دونوں چلے جا رہے تھے۔ میرے کانوں میں میٹھی میٹھی آواز گونج رہی تھی۔ اور ٹھنڈا ٹھنڈا

ریت نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ اسی طرح بین بجاتے بجاتے میں ٹیلے کے نیچے پہنچ گیا۔ اور پھر ٹیلے سے کچھ قدم ہٹ کر آرام سے ریت پر بیٹھ گیا۔ میں نے خالی پٹارے کھول کر اپنے قریب رکھ لئے اور کپڑے کا ٹکڑا اپنی گود میں دھر لیا۔

میں بین بجا رہا تھا۔ اور بین کی رسیلی آواز روح میں نئی زندگی پیدا کر رہی تھی۔ پورا چاند تھا۔ مجھے اپنے آس پاس کی سب چیزیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اور میری آنکھیں ٹیلے پر لگی ہوئی تھیں۔ بین کی آواز صحرا میں پھیل رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کوئی چیز ٹیلے پر سے لڑھکتی ہوئی آئی۔ میری انگلیاں بین کے سوراخوں پر تھرکنے لگیں۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی سفید ناگن جو آپ دیکھ چکے ہیں۔ مست ہو کر میرے سامنے آگئی۔ اور اپنا خوبصورت پھن ریت سے کافی اونچا اٹھا کر بین کی آواز کے ساتھ ساتھ جھومنے لگی۔

ناگن مست تھی اور جھوم جھوم کر اپنی پتلی پتلی زبان جلدی جلدی نکال رہی تھی۔ جیسے اپنے ہونٹوں پر لگی ہوئی مٹھاس کو چاٹ رہی ہو۔ بین بج رہی تھی۔ اور سفید ناگن مدہوش ہو کر ناچ رہی تھی۔ کافی دیر اسے بین پر کھلانے کے بعد جب میں نے دیکھا۔ کہ ناگن اپنے ہوش میں نہیں اور پوری طرح تھک چکی ہے۔ میں نے جلدی سے بین پر سے اپنا ایک ہاتھ اٹھایا اور پاؤں کے اشارہ سے پٹارے کو آگے پھینک دیا

پٹارہ کے آگے گرتے ہی ناگن نے غصہ میں آکر اس پر اپنا خوبصورت پھن مارا۔ اور میں نے اس کے پھن مارتے ہی فوراً اس کی گردن پکڑ لی۔ اور پٹارہ میں ڈال کر ڈھکن بند کر دیا۔ ناگن میری قید میں تھی اور میں بہت خوش تھا۔

کہ مجھے اپنے پیچھے چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نیستا سفید ناگ کو اپنے ہاتھوں میں پکڑے اس طرح کھڑی تھی۔ جیسے کوئی پوجارن اپنے دیوتا کے چرنوں میں دودھ دھار باندھ کر ڈال رہی ہے۔ چندا کی کرنوں کا مینہ برس رہا تھا۔ اور وہ ظالم اس کے ہاتھوں میں لہرا رہا تھا۔ عورت ذات زہریلے جانور کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ اور میرے بڑھتے ہی وہ نیستا کو ڈس کر ایک طرف دوڑ گیا۔ اور ریت کے ٹیلوں میں کہیں غائب ہو گیا۔

نیستا ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر گر گئی۔ وہ مر چکی تھی۔ اور اس کا رنگ نیلا پڑ گیا تھا۔ نیستا کو دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو نکلے اور اس کے قریب ہی گر کر مٹی میں جذب ہو گئے۔ میں تھوڑی دیر تو نیستا کے پاس کھڑا رہا۔ اس کے بعد اس کو اسی حالت میں چھوڑ کر بستی کی طرف چل دیا۔ ناگن میرے پاس تھی۔

بستی میں پہنچنے کے بعد میں نے کئی آدمی اپنے ساتھ لئے اور مری ہوئی نیستا کے پاس پہنچا۔ نیستا کی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ میں نے دوسرے آدمیوں کی مدد سے روتے ہوئے ایک گڑھا کھودا۔ اور نیستا کو اسی جگہ اپنے ہاتھوں سینکڑوں من مٹی کے نیچے چھپا دیا۔

پرائی ناگن کو پکڑ کر اپنی وفادار ناگن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ میری ناگن مجھ سے روٹھ گئی۔ اور مجھے ڈس کر بادلوں کے اس پار چلی گئی۔

صاحب۔ اب رونے سے کیا حاصل؟" ناگپال نے اپنی باہنہ سے آنکھیں صاف کیں اور پٹارہ کی طرف انگلی کر کے بولا۔

"یہ تھی وہ ناگن، جس کی وجہ سے کئی جانیں ضائع ہوئیں۔ اور نیستا کو بھی کھو دیا

ناگ ہاتھ سے نکل گیا۔ اگر وہ بھی قابو میں آجاتا۔ تو زیادہ دکھ نہ ہوتا۔ اور لوگوں کو اس موذی سے بھی چھٹکارہ مل جاتا۔

نینتا کے مرنے کے بعد اس بستی میں میری طبیعت گھبرانے لگی۔ اور وہاں کی ہر چیز مجھے نینتا کی یاد دلانے لگی۔ میرا وہاں جی نہ لگا۔ نینتا کی جوان موت مجھے بار بار رلانے لگی۔ کئی دن تک تو میں نے اس خیال سے گزارے کہ شاید نینتا کا غم ہلکا ہو جائے۔ لیکن نہیں۔ غم تھا کہ بڑھتا ہی گیا۔ میرے کلیجے میں سوزش سی ہونے لگی۔ آخر تنگ آ کر وہ جگہ چھوڑ دی۔ اب جگہ جگہ گھومتا ہوں اور بین بجا بجا کر ان کیڑے مکوڑوں کو دکھلاتے ہوئے اپنا پیٹ پالتا ہوں۔

رات ہو گئی تھی اور سب لوگ سو چکے تھے۔ یہ اچھا ہوا کہ آپ مل گئے۔ ورنہ کون جانے رات کس طرح گزرتی۔ کوئی پڑے رہنے کو جگہ دیتا بھی یا نہیں۔ میرے پاس کئی اور سانپ ہیں۔ کہو تو دکھاؤں بابو جی۔ ناگپال نے اپنی کہانی سنانے کے بعد پٹاروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا

"بس اب رہنے دو۔ صبح دیکھیں گے۔"

"جیسے سرکار کی مرضی۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔" زبیدی کے کہنے پر ناگپال نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ اور زبیدی کی طرف دیکھنے لگا۔

(زیر تصنیف۔ ناول جنگلی کا ایک باب)

ٹیووھٹ ٹیوھو

پربتوں کی چوٹیوں پر جب پریوں کے ہلکے پروں کا دھیما دھیما سا سایہ پڑتا ہے۔ دیوتا اداس ہو جاتے ہیں۔ ان کی گرم گرم آہوں سے کوہساروں کی سفید سفید اور گوری گوری چھاتیاں پگھل کر ساگر بن جاتی ہیں۔ اور وہ درد کے مارے انسان کا دل اس طرح توڑ دیتے ہیں۔ جیسے روٹھا ہوا بچہ ایک کھلونا۔

کسی کا دل پارہ پارہ ہوا، زندگی دوبھر ہوئی اور کھلاڑی کا کھیل ٹھہرا۔

ظفر کو دور سے اپنے گاؤں کے کچے کچے مکانات دکھائی دیے۔ وہ پکی سڑک کو چھوڑ کر تنگ۔ پگڈنڈی پر ہو لیا۔ بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی کھیتوں میں سے ڈوبتی ابھرتی، جوہڑ کے گرد چکر کاٹ کر گاؤں کی میلی کچیلی گلیوں میں گم ہو گئی تھی۔

"کہو رمضانی چاچا، خوش تو ہو۔" جوہڑ کے سرہانے کھڑے ہوئے بیری کے درخت کے نیچے پہنچ کر ظفر پکارا۔

"ارے بیٹا ظفر! تو کب آیا؟" کنارے کے قریب پانی میں کھڑی ہوئی بھینس پر پانی کی بالٹی انڈیل کر رمضانی سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"ابھی آ رہا ہوں چاچا۔"

"بہت دنوں کے بعد آئے بیٹا۔" رمضانی پانی میں سے نکل کر باہر آ گیا۔

"ہاں چاچا۔ پورے دو سال بعد آیا ہوں۔"

"چاچا۔"

"ہاں"

"گاؤں کی حالت بدل گئی کیا؟" ظفر نے ادھر ادھر دیکھ کر رمضانی سے پوچھا۔

"حالت تو وہی ہے۔ تم بہت دنوں کے بعد آئے ہو نا۔" رمضانی ہنسنے لگا۔

"شاید یہ وجہ ہو۔ ہاں یہ تو بتلاؤ! گاؤں میں تو سب خیریت ہے۔"

"ہاں بیٹا! سب خیریت سے ہیں۔ صرف کریما کی بیوی مر گئی ہے۔"

"کریما۔"

"ارے وہی اللہ داد کا باپ۔"

"اچھا۔ کب؟"

"ایک سال ہو گیا ہو گا۔"

"اور؟"

"اور سب ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"فصلوں کا کیا حال ہے؟"

"فصل۔ اچھی ہوئی ہے۔ لیکن تمہیں فصلوں سے کیا؟ چاہے اچھی ہو یا بُری۔ تمہیں تو بے فکر کھانے کو ملتا ہے۔ دن میں کئی کئی دفعہ۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" ظفر ہنس دیا۔

"جھوٹ تو نہیں۔ اپنے شرفو کو ہی دیکھ لو۔ پورا بھینسا ہو گیا ہے۔ وہاں جا کر۔"

"شرفو؟" ظفر کچھ سوچنے لگا۔

"لو تم تو سب کو ہی بھول گئے ہو۔" ارے وہی اپنے نیجا کا لڑکا، جو کل کل تک گاؤں چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا۔ نمبردار کے بھرتی کرانے کے بعد ایسا گیا کہ ایک دفعہ آنے کے بعد پھر شکل تک نہیں دکھائی۔ آج اسے پورے تین سال ہو گئے ہیں۔"

"فوج کی بات ہی کچھ ایسی ہوتی ہے۔"

"نہیں بیٹا! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ تم اپنے ہی کو دیکھ لو۔ اس سے بڑے عہدے پر ہو۔ لیکن پھر بھی اپنے گاؤں والوں کی عزت کرتے ہو۔ اور ایک وہ ہے کہ گاؤں والوں کو اجڈ گنوار اور خدا جانے کیا کیا سمجھنے لگا ہے۔"

پردیسی کی پریت کو سب کا دل للچائے

پردیسی میں کھوٹ ہے، رہے نہ سنگ لیجائے

بانسری کی آواز جوہڑ کے کثیف پانی پر سے کپکپاتی ہوئی کھیتوں میں جا کھوئی۔ نوجوان دیہاتنوں کے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ اور وہ دور خلاؤں میں کچھ ڈھونڈنے لگیں۔

"کون ہے یہ؟ بڑا سوز ہے"۔

"کمالا ہوگا" تمام دن بانسری بجانے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔

"اچھا چاچا۔ اب چلونگا" ظفر نے سوٹ کیس اٹھا لیا۔

"لاؤ بیٹا میں پہنچا دوں"۔

"نہیں چاچا! میں خود ہی لے جاؤں گا"۔

سورج بوڑھے برگد کے پتوں میں سے جھانکنے لگا تھا۔ پنہارنوں نے کنوئیں میں ڈول ڈالے۔ اور نوجوان کلائیوں میں رنگ رنگ کی چوڑیاں کھنکیں۔ لوہے کے ڈنڈوں میں لگے ہوئے کاٹھ کے پہیے رسوں کی رگڑ کی تاب نہ لاکر اوں اوں کرنے لگے۔ ظفر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ انہیں گھورتا ہوا قریب سے نکل گیا۔

"ظفر ہے"۔

"دیکھ لو! سنڈا ہو کر آیا ہے"۔

"سنڈا ہوئے نہ کیسے۔ نہ کام نہ کاج۔ بس کھانے سے کام"۔

"ہاں لو! فوج میں آٹھ آٹھ دفعہ دن میں کھانے کو ملتا ہے"۔

"پنہارنیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں"۔

"ظفر چاچا آگئے"۔

"ہاہاہا چاچا جی آگئے"

"امی چاچا آگئے"

ظفر کو دیکھ کر مٹی میں کھیلتے ہوئے بچے چلّاتے ہوئے دوڑ کر سامنے مکان میں گھس گئے۔

"کہو بھابھی — راضی تو ہو"

"ارے ہٹ نہ سلام نہ دعا، فوج میں رہ کر تو تیری عادت ہی بگڑ گئی ہے" ظفر کی بھابھی نے پہلے مصنوعی غصّے کا اظہار کیا اور پھر مسکرا دی۔

"آنے سے پہلے اگر دو پیسے کا خط ڈال دیتے تو"

"دو پیسے کا نہیں، تین پیسے کا کہو بھابھی — تم تو گورنمنٹ کے گھر میں ہی گھاٹا ڈالنے لگیں"

"چل تین پیسے کا سہی — چٹھی اگر بھیج دیتے تو سٹیشن سے پیدل کیوں آنا پڑتا"

"ارے بھابھی — میل بھر کا فاصلہ بھی کوئی فاصلہ ہے — چلو ٹانگیں ہی کھل گئیں"

"تو کیا پہلے بندھی ہوئی تھیں" ظفر کی بھابھی مسکرا کر بولی — "اچھا یہ سوٹ کیس مجھے دے دے اور تو جا کر منہ ہاتھ دھولے۔ تھکا ہوا ہوگا"

ظفر صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

"چاچا! کیا لائے ہو؟ ہمیں بھی دو"

"نہیں چاچا۔ پہلے مجھے —"

"نہیں پہلے میں لوں گا"

"نہیں چاچا۔ میں لوں گی۔"

"اچھا بھئی ذرا سانس تو لینے دو۔"

"سانپ نہیں چاچا، ہم تو کھلونے لیں گے۔ میٹھی میٹھی گولیاں لیں گے۔"

"سانپ نہیں پگلے، سانس۔" ظفر نے ہنس کر وحید کے منہ پر آہستہ سے چپت ماری۔

"مجھے چیز دو۔"

"پہلے میں لوں گی۔"

"اوں اوں چاچاجی۔ پہلے میں۔"

"ہٹ نعیمہ کی بچی۔ میں بڑا ہوں پہلے میں لوں گا۔"

"چاچاجی۔ اسے مت دینا۔ یہ مجھے مارتا ہے۔" اوں، اوں،

"وحید۔ نعیمہ۔ اصغر۔ کیوں آتے ہی تنگ کرنے لگے ہو۔" بھابھی کے دھمکانے پر بچے چپ ہو کر ایک طرف ہٹ گئے۔

"بھابھی! بھیا نہیں دکھائی دیئے؟"

"وہ آج ذرا دیر سے لوٹیں گے، نمبردار کے یہاں گئے ہیں۔"

"کیوں؟"

"ویسے ہی۔ کوئی کام ہوگا۔"

"چلی آ نور۔ یہ تو اپنا ظفر ہے۔" دروازہ میں ایک دوشیزہ کو جھجکتے دیکھ کر ظفر کی بھابھی بولی۔ اور نور لمبا سا گھونگٹ نکال کر، گوری گوری کلائی والے ہاتھ سے، دوپٹہ کا پلو تھامے اندر چلی گئی۔

"نور، ستمگر۔ دو سال کے بعد تو کہیں شکل دیکھی ہے۔ مجھ سے مکھڑا چھپانے کی کیا ضرورت تھی" ظفر کا دل دھڑکنے لگا۔ "کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ نیم کی طرح۔ خبر نہیں مجھے پہچانے گی بھی یا نہیں۔ کہیں بیتے ہوئے ان دنوں کو بھول تو نہیں گئی۔ جب ہم جنید! کی چھاؤں میں آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔ بوڑھا برگد جھوم اٹھتا تھا۔ اور یہ گاؤں کے سب لڑکوں کو چھوڑ کر مجھے اپنا ساتھی چنتی تھی۔ میرے بغیر اس کا دل اداس ہو جاتا تھا" ظفر کے دل میں دھڑکنیں جاگ اٹھیں اُس نے جوتا دوبارا پہن لیا۔ اور چارپائی پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا بھابھی میں ذرا گھوم آؤں"

"ابھی تو آ کر بیٹھے ہو۔ دم بھر تو سستا لو!" پھر گھوم آنا۔ گاؤں کہیں بھاگا تو نہیں جاتا"

"بس ابھی آیا" ظفر کہتا ہوا مکان سے نکلا اور چند قدم ٹھہر کر کچھ سوچنے لگا۔ چند منٹ ٹھہرنے کے بعد اس نے مکان سے ملحق کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔ اور چپ چاپ اندر داخل ہو گیا۔ کوٹھڑی کے اندر سوکھی گھاس اور چارہ پڑا تھا۔

سنہری کرنیں برتنوں سے اٹھ اٹھ کر غائب ہونے لگیں۔ اونچے اونچے اشجار کی چوٹیاں پژمردہ ہو گئیں۔ دیوتاؤں نے اپنی کمریں کھولیں، دیویاں جیت گئیں اور تھکا ہارا پنچھی واپس لوٹ آیا۔

ہش۔ سامنے سے گذرتی ہوئی نور کا ہاتھ پکڑ کر ظفر نے اسے اندر کھینچ لیا۔

"کون ہو تم"

"اچھا"

"چھوڑو بھی کوئی دیکھ لیگا"

"کوئی دیکھ لے گا۔ تو ہمارا کیا لے گا"

"مجھے گھر جانا ہے۔"

"چلی جانا"

"چھوڑو میرا ہاتھ" نور نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"نور۔"

"مجھے جانے دو"

"روکتا کون ہے ۔ ارے ٹھہرو تو۔ تم تو سچ مچ ہی جانے لگیں" ظفر نے نور کا ہاتھ چھوڑ کر پھر پکڑ لیا۔

"اب گھونگھٹ ہٹا دو" ۔ظفر کے کہنے پر نور نے گھونگھٹ ہٹانے کی بجائے منہ پھیر لیا۔ اس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔

"یہاں تو پہلے ہی اندھیرا ہے۔ گھونگھٹ کا کیا فائدہ؟"

"نور! کچھ تو بولو۔ بھول گئیں کیا؟ ۔ میں وہی ظفر ہوں۔ جس کے بغیر تم رو دیا کرتی تھیں۔"

"وہ اور بات تھی" نور گھونگھٹ میں سے بولی۔

"اب کیا ہو گیا؟"

"اب تو سب کچھ ہی بدل گیا ہے"

"نہیں نور۔ تمہارا خیال ہے" ظفر نے نور کے منہ پر سے گھونگھٹ ہٹا دیا۔

نور نے اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

" نور زیادہ نہ ستاؤ! ظفر نے نور کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے جھٹکا مارا۔ نور گھاس پر گر پڑی، اور ظفر بھی قریب ہی گر پڑا۔

" ہاں اب بتلاؤ! کیا سچ مچ تم مجھ سے ناراض ہو" نور نے جواب دینے کی بجائے منہ پھیر لیا۔

" نور ——" ظفر نے ہاتھ بڑھا کر نور کو اپنی طرف کھینچ لیا اور بولا

" نور میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا ساتھی سمجھا ہے "

نور بولو! — نور نے جواب دینے کی بجائے اپنا ہاتھ بڑھایا اور ظفر کا گال سہلانے لگی۔

" نور یاد ہے نا! جب میں کسی سے لڑ پڑتا تھا۔ تو تم اس کے بال نوچنے کو تیار ہو جاتی تھیں"

" اس وقت تمہیں میری ضرورت تھی "

" اور اب "

" اب تم خود بال نوچ سکتے ہو "

" لیکن صرف تمہارے " ظفر نے دونوں ہاتھوں سے نور کا سر پکڑ کر ہلا دیا۔

" ہٹو بھی بے درد " نور نے ظفر کے منہ پہ ہاتھ رکھ کر اسے پرے دھکیل دیا۔

" بے درد اور میں "

" ہاں —— تم " نور مسکرا دی۔

" اور تم ——

"جھوٹ"

"تو کیا تم واقعی سنگدل نہیں ہو" ۔ ظفر نے اپنا منہ نور کے بالکل قریب کر لیا۔ اور نور نے شرما کر پہلو بدلا

"جب سے بھرتی ہوئے ہو۔ مجھے کبھی یاد بھی کیا تم نے"

"ہر روز تو یاد کرتا تھا"

"جھوٹے کہیں کے" نور نے کروٹ لے کر ظفر کی طرف دیکھا اور اسکے بکھرے ہوئے بال ظفر کے منہ کو چھونے لگے "تمہیں کیا معلوم یہ سال میں نے کس طرح گزارے ہیں ۔ تم تو آگ لگا کر چلے گئے ۔ اور میری خبر تک بھی نہ لی چندا کی ٹھنڈی کرنیں جس وقت نورانی چادر بچھاتی تھیں ۔ تب میں تنہا چھت پر کھڑے ہو کر برگد کی چھاؤں میں تمہیں ڈھونڈا کرتی تھی ۔ لیکن وہاں اداسیوں کے سوا رکھا ہی کیا تھا ۔ نور نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور ظفر کی قمیض میں لگے ہوئے بٹن کو گھماتے ہوئے بولی ۔

"جب میرے دل میں آگ زیادہ سلگنے لگتی اور تمہاری یاد آتی تو میں سوتے سوتے اٹھ کر رونے لگ جایا کرتی تھی ـــــ خدا جانے تم نے کبھی مجھے یاد بھی کیا ہوگا یا نہیں" نور کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ۔ اور ظفر نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا ۔

"ایک پل بھی تمہاری یاد سے غافل نہیں رہا ہوں ـــــ مجھے ہر وقت تمہاری یاد ستاتی تھی اور میں چاہتا تھا کہ تمہاری زبان سے وہی پریوں اور دیوؤں کے قصے سنوں جو اکثر تم اپنی دادی جان سے سن کر مجھے سنایا کرتی تھیں ۔ میرے دل میں ہر گھڑی یہ لگن رہتی تھی ۔ کہ تم میرے پاس ہو ۔ میں تمہاری گود میں گر پڑوں اور تم ـــــ

تم میری پیشانی پر اپنا منہ رکھ کر بے ساختہ رو دو ۔ تمہارے نمکین آنسو میرے لبوں سے چھونے لگیں اور میں مسکرا دوں ۔ تم ناراض ہو جاؤ اور مچل کر میرے سر پر تھپڑ مار کر مجھے اپنی گود سے پرے دھکیل دو۔"

"جھوٹ ــــــ"

" نہیں رانی ۔" ظفر نے اپنا سر اٹھا کر نور کے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ دیا۔

چندا کی کرنیں پھوٹیں اور برگد کی پرچھائیاں ٹھنڈے ریت پر سو گئیں۔ ایک کونے میں گیدڑ چیخے اور دور اجاڑ میں "ٹیو وھٹ ٹیو ہو" الو بولا۔

" اب مجھے جانے دو۔ اندھیرا پھیل گیا ہے۔"

" اندھیرا کہاں چاند نکل رہا ہوگا۔"

" مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

" نہیں نور۔" ظفر اپنے سر کا دباؤ نور کے سینے پر دیتے ہوئے بولا۔

" ضد مت کرو! کہیں ایسا نہ ہو کہ آج ہی سب کام چوپٹ ہو جائے ۔ تم بھی یہیں ہو اور میں بھی۔" نور ظفر کا سر گھاس پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کپڑے جھاڑنے لگی

"نور!"

"ہوں"

" تھوڑی سی دیر۔"

" پاگل ہو گئے ہو کیا" نور چلی گئی ۔ اور ظفر کپڑے جھاڑ کر کوٹھڑی سے نکلا اور کواڑ بند کر کے اپنے مکان میں گھس گیا۔

"ظفر!"—

"ہاں بھیا"۔ ظفر کے مکان میں داخل ہوتے ہی اس کا بڑا بھائی بولا۔

"کل راجن پور چلنا ہے"

"میرا جانا ضروری ہے؟"

"ہاں"

دوسرے دن پو پھٹنے سے پہلے ظفر اور اس کا بھائی راجن پور میں داخل ہو گئے۔ ظفر کا دل تمام دن اداس رہا اور اس نے وہ دن ادھر ادھر گھوم کر گزارا۔ ظفر کا بھائی اپنے کاموں سے فارغ ہو گیا۔ لیکن گاؤں کے چوہدری نے اسے ایک دن کے لئے اور روک لیا۔ ظفر کے بھائی کو تو کچھ محسوس نہ ہوا۔ مگر ظفر کے لئے وہ دن قیامت کا دن بن گیا۔ اور اس نے ایک ایک لمحہ رو رو کر گزارا۔ آخر خدا خدا کر کے وہ گھڑی آئی جب بیل گاڑی میں جوڑ دیئے گئے۔ اور گاڑیبان نے بیلوں کو ہانکا۔ ظفر کو اپنے گاؤں کے کچے کچے مکانات اور بوڑھا برگد دکھائی دیا۔ اس کی مرجھائی ہوئی طبیعت کھل اٹھی۔

"نور جلدی سے آجاؤ"۔ ظفر نے نور کو اپنے مکان سے نکلتے ہوئے دیکھ کر سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ اور اس کے قریب سے نکلتا ہوا گھاس کی کوٹھڑی میں گھس گیا۔ کافی دیر بعد نور آئی۔ ظفر نے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"نور اب تو تم بہت ہی تڑپانے لگی ہو"۔ ظفر نے شکوہ کیا۔

"اور تم"— نور نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کر ظفر کی طرف دیکھا۔

"میں بے چارہ کسی کو کیا تڑپا سکتا ہوں"

"اچھا جی"— نور نے گھائل کر دینے والی نگاہوں سے دیکھا اور ظفر نے اسے پکڑ

کر اپنے سینے سے لگالیا۔

"نور"!

"ہوں"

"نور!!"

"ہاں ہاں تم تو کان ہی کھا لیتے ہو" نور ظفر سے علیحدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی

"بہت ہی ظالم ہو"

"کیا کہا؟"

"یہی کہ پتھر دل ہو"

"جاؤ نہیں بولتے" نور نے روٹھ کر منہ پھیر لیا۔

"ارے کیا ہوا" ظفر نے قدم بڑھا کر نور کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ نور نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ اور منہ سے کچھ نہ بولی۔

"نور" ظفر نور کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ہٹو بھی" نور پھر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"ہوا کیا ہے تمہیں؟"

"کچھ بھی نہیں" نور پیچھے ہٹتی ہوئی گھاس کے ڈھیر کے قریب پہنچ گئی۔

"پھر بھی"

"کہہ جو دیا۔ میں جانا چاہتی ہوں"

"میں ایسے نہیں جانے دوں گا" ظفر نے آگے بڑھ کر نور کو اپنی بانہوں میں لے لیا وہ مچلتے ہوئے بولی۔

"واہ یہ بھی خوب ہی رہی۔"

"خوب ہی سمجھ لو۔"

"دیکھتی ہوں کیسے نہیں جانے دیتے۔" نور نے ظفر کے بازوؤں میں سے زبردستی نکلنا چاہا۔ مگر ظفر نے اسے دھم سے گھاس پر گرا دیا۔ اور خود بھی اس کے ساتھ ہی گر پڑا۔

"ارے پڑی بھی رہو۔" نور کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر ظفر نے اسے پھر لٹا دیا۔

"اب بولو!"

"کیا بولوں؟"

"اکڑ کیوں رہی ہو۔"

"تم نے بات ہی ایسی کہہ دی۔" نور نے اپنا منہ پھیر لیا۔

"آخر کیا کہہ دیا۔" ظفر نے ہاتھ بڑھا کر نور کا چہرہ پھر اپنی طرف کر لیا۔

"یہی کہ میں ظالم ہوں۔"

"بس۔" ظفر زور سے ہنس پڑا اور اس نے چت لیٹ کر اپنے دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا دیئے۔

"ہنستے کیوں ہو؟" نور نے دونوں ہاتھوں سے ظفر کا گریبان پکڑ لیا اور اسے ہلانے لگی۔

"تم نے بات ہی ایسی کہہ دی۔" ظفر پھر ہنس پڑا۔

"ظفر۔" نور ظفر کے سینے پر پڑ گئی۔ وہ اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں پریشانہ کرتے ہوئے بولی۔ "تم مجھے ظالم نہ کہا کرو۔ میں یہ بس چاہتی کہ میں تمہیں اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔ وہ تم مجھے اس طرح پکارو۔ میرا دل تو قربان ہو چکا۔ میں چاہتی

ہوں۔ کہ جب تک بھی جیوں۔ اپنے پریمی کی باہنوں میں جھولتی رہوں' ۔ ان کنواریوں کی طرح جو اکثر ساون کی پھواروں میں مست ہو کر آم کی ڈالی پہ پڑے ہوئے جھولوں میں جھولتی ہیں۔ اور عجیب عجیب ملہار گایا کرتی ہیں ـــــ اسی طرح جھولتے جھولتے میرے سانس ختم ہو جائیں۔ تاکہ میں اپنی محبت کو خدائے کریم کے حضور میں ایک انوکھے تحفے کے طور پر پیش کر سکوں اور میرا سر اونچا رہے ـــــ میں نے سب کچھ پا لیا۔ میرے مالک"

نور ظفر کے سینے پر اپنا سر رگڑنے لگی۔

"تم نے سب کچھ پا لیا"

"ہاں ـــ" نور نے ہاں کہتے ہوئے گھاس کا ایک سوکھا تنکا اٹھا لیا۔ اور ظفر کے ہونٹوں سے کھیلنے لگی۔

"اور میں نے سب کچھ کھو دیا"

"وہ کیسے ؟" نور نے اپنی دونوں کہنیاں ظفر کے سینے پر رکھیں اور اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں چہرہ کو رکھ کر ظفر کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم نہیں جانتیں ؟" سوالیہ نگاہوں سے ظفر نے نور کی طرف دیکھا اور نور نے اپنا سر ہلا دیا۔

"نور جب سے دل لگایا ہے۔ یہ بدبخت کہیں بھی تو نہیں لگتا"

"کیوں ؟" نور ہونٹوں کو بھینچ کر مسکرا دی۔

"بہت ہی پتھر دل ہو ـــــ جانتے ہوئے بھی انجان بننے کی کوشش کر رہی ہو" ظفر نے نور کی کلائیاں پکڑ لیں اور غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ نور نے بھی کر نگاہیں نیچی کر لیں۔

"جھوٹے۔"

"نہیں نور۔" ظفر نے نور کو اپنے سینے سے لگا لیا

"خوب باتیں بنا رہے ہو آج تو۔"

"اوں نہیں ــــ سچ کہتا ہوں۔ دل میں اب تو یہی آرزو ہے۔ کہ تم میرے سامنے بیٹھی رہو اور میں ہمیشہ دیکھتا رہوں۔"

"اوہو ــــ" نور ظفر کے سینے پر سے اٹھ کر گھاس پر بیٹھ گئی۔ اُس نے گھاس کا ایک تنکا اٹھا کر منہ میں لے لیا۔ اور جھٹکے مار مار کر اسے توڑتے ہوئے بولی

"کیا لگا ہے مجھ میں۔"

"تمہیں نہیں معلوم۔" ظفر بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اونہوں۔" نور سر ہلاتے ہوئے مسکرا دی۔ ظفر نے اسے پکڑ کر اپنی گود میں لٹا لیا۔ اور اس کا سر آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔

"ظفر۔یوں نہ کرو۔ مجھے اپنی گود میں دو گھڑی سستا لینے دو۔ تمہیں کیا معلوم تمہاری جدائی میں وقت کیسے گزارتی ہوں۔"

"نور ــــ میرا دل پھٹ جائے گا۔ چپ رہو!۔" نور چپ ہو گئی اور ظفر نے اپنا سر جھکا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ کافی دیر تک دونوں چپ چاپ پڑے رہے۔ آخر نور نے سکوت کو توڑا۔ اور ظفر سے اجازت لے کر چلی گئی۔

شام کے ٹھنڈے سایوں میں سورج کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ پنہارنوں نے اپنی بھری بھری بغلوں میں گھڑے دبائے اور کنوئیں پر پہنچ گئیں۔ گاؤں کی گلیوں میں بچے بھاگنے لگے۔ ظفر گلیوں کا چکر کاٹ کر، برگد کے درخت کے نیچے سے ہوتا ہوا

کنوئیں پر پہنچا۔ نور ڈول کھینچ رہی تھی۔ ظفر چپکے سے کنوئیں کے پکے چبوترے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"بھیّا کیوں کھڑے ہو؟"

"کچھ نہیں ویسے ہی۔" سانولی لڑکی کے پوچھنے پر ظفر جھینپ سا گیا۔ اور بولا "پیاس لگی ہے۔"

"پیاس لگی ہے تو لو پانی پی لو۔" سانولی لڑکی نے بالٹی ظفر کے سامنے رکھ دی

ظفر نے تھوڑا سا پانی پیا۔ اور جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کرنے لگا۔

"کب جاؤ گے بھیّا؟" وہی لڑکی بولی

"کہاں؟"

"اپنی نوکری پر۔"

"تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں۔"

"تمہاری تو یہاں طبیعت ہی نہیں لگی ہوگی۔"

"یہاں سے تو جانے کو ہی دل نہیں چاہتا۔"

"تو پھر نہ جائیے ——"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

نور گھڑا بھر کر چلی بھی گئی۔ ظفر نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور ٹہلتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔

کئی دن یونہی گزر گئے۔ ظفر اور نور کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک دن ظفر گلی میں سے گزر رہا تھا۔ کہ اسے سامنے سے نور آتی ہوئی دکھائی دی۔

"نور۔" نور جب پاس سے گزری تو ظفر نے اسے آواز دی۔ سامنے سے دو تین عورتیں آ رہی تھیں۔ نور وہاں نہ ٹھہری اور ظفر بھی سیدھا نکل گیا۔

چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ کوشش کرنے پر بھی ظفر نور سے نہ مل سکا۔ آخر ایک دن جب نور پانی کا گھڑا بھر کر آ رہی تھی۔ ظفر اس کے قریب پہنچا اور کہنے لگا۔

"نور! میں جا رہا ہوں ۔۔۔ اگر ملنا چاہو تو شام کو میں انتظار کروں گا۔" نور سنتی ہوئی چلی گئی۔ اور ظفر گھر جا کر چارپائی پر بے سدھ پڑ گیا۔

سورج کی کرنیں ترچھی ہو گئیں۔ اور مکانوں کے سائے پھیل گئے۔ ظفر کوٹھڑی میں گھس کر نور کا انتظار کرنے لگا۔

"روٹھ کیوں گئی ہو نور۔" نور کے اندر داخل ہوتے ہی ظفر کھڑا ہو گیا۔ نور منہ سے کچھ نہ بولی اور چپ چاپ گھاس پر بیٹھ گئی۔

"نور۔۔۔" ظفر نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ نور کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ "نور کہاں رہی اتنے دن؟ کیوں مجھے تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہو"۔ نور کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ ظفر نے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی اور وہ دھم سے اس کی گود میں گر کر سسکیاں لینے لگی۔

"نور۔۔۔ نور۔ ہوا کیا ہے تمہیں؟"

"کچھ نہیں۔۔۔" نور اٹھ کر بیٹھ گئی

"تو پھر یہ آنسوؤں کی رم جھم۔۔۔"

"دیوانے ہیں۔" نور جواب دے کر خاموش ہو گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد خود ہی بولی

"ظفر تمہارے پاس سے جا کر میری طبیعت بہت ہی خراب ہو جاتی ہے۔"

"اسی لئے نہیں آئی۔"

"ہاں" دونوں تھوڑی دیر کے لئے پھر چپ ہو گئے۔

"تم جا رہے ہو نا۔"

"ہاں نور میں جا رہا ہوں۔" ٹھنڈی سانس لے کر ظفر بولا۔

"تو جاؤ۔" نور نے ناراض ہو کر منہ پھیر لیا۔

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔"

"تم کیوں سمجھنے لگے۔ میں کہتی ہوں۔ نہ جاؤ۔" نور نے غصہ میں آ کر ظفر کا گریبان پکڑ لیا اور جھٹکے دینے لگی۔ قمیض کے بٹن ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔

"نور عقل سے کام لو۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" نور نے اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا لیا اور ظفر کے سینے سے لگ گئی۔

"میری زندگی میں اب کوئی خوشی نہیں رہی۔ میں تباہ ہو چکی ہوں ظفر۔"

"یہاں بھی یہی حال ہے۔"

"ظفر مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔" نور نے اپنے دونوں ہاتھ ظفر کے دونوں گالوں پر رکھ دئے۔

"میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔"

"یہ سب جھوٹی تسلیاں ہیں۔"

"مجھ پر بھروسہ رکھو۔"

"نہیں ظفر نہیں"۔ نورہ کی آنکھوں سے پھر آنسو نکلنے لگے اور وہ کھڑی ہوگئی۔

"نور—"

"نور مر گئی" اور وہ اپنی بانہوں سے آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ظفر چلا گیا۔ گاؤں کی رنگین شامیں پھیکی پڑ گئیں۔ بوڑھا برگد اداس ہوگیا۔ اور اُس کی ٹہنیوں پر کووں نے اچھلنا بند کر دیا۔ ایک سال دیکھتے ہی دیکھتے گذر گیا۔ جانے والے نہ آئے اور انتظار کرنے والوں کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔

گاؤں سے دور گھڑیال نے چار بجائے۔ دیوتا مسکرانے لگے۔ اور سورج کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ پہاڑیوں کی اونچی اونچی چوٹیوں کے سائے وادیوں پر پھیل گئے— حسین پریاں غاروں سے نکل نکل کر وادیوں میں بکھر گئیں۔ اور رنگا رنگ کے پھول اپنے نازک نازک ہاتھوں سے چھنتے ہوئے آپس میں ہنسی مذاق کرنے لگیں۔ جیسے الہڑ کنواریاں جھگڑ رہی ہوں۔ پتھروں پر بیٹھے ہوئے دیوتا لطف اٹھا رہے تھے۔

ظفر لینی کے سٹیشن پر اترتے ہی سیدھا گاؤں کی طرف ہولیا۔ چاروں طرف حسرت سی برس رہی تھی۔ اور کچی سڑک دور تک پھیلی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھی— ادھر ادھر کھڑی ہوئی جھاڑیوں میں کہیں کہیں جنگلی چڑیا بولنے لگی۔

"ارے ظفر بیٹا— آ—"

"رمضانی چاچا۔ تم کہاں؟"

"ارے میں تو یہیں ہوں۔ اپنی سنا۔ رمضانی نے بیل گاڑی روک لی

"آ بیٹھ جا"

"سناؤ چاچا! آج کہاں کے دورے لگ رہے ہیں" ظفر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اور سوٹ کیس برابر رکھ لیا۔

"اپنے زمیندار کے بڑے لڑکے کی شادی ہے۔ سٹیشن سے آتشبازی کا سامان لے کر آ رہا ہوں۔"

"تو پھر یوں کہو چاچا زمیندار کے لڑکے کی شادی خوب دھوم دھام سے ہو رہی ہے"

"پیسے والا ہے بیٹا۔ کس چیز کی کمی ہے۔ چلو بے تمہیں کیا ہو گیا؟" رمضانی نے بیلوں کی پونچھ مروڑی۔ اور تڑا تڑ دو تین ڈنڈے ان کی پیٹھ پر رسید کر دیئے۔ بے زبان بیل پھنکارتے ہوئے کچی سڑک پر بھاگنے لگے۔

"بہت جلدی ہے چاچا"

"ہاں بیٹا جلدی تو بہت ہے۔ مگر یہ مردود چلتے ہی نہیں۔" ظفر کو جواب دے کر رمضانی نے بیلوں کی پیٹھ پر ایک ایک ڈنڈا اور جما دیا۔ بیل اور تیز ہو گئے۔ اور گاڑی پہیوں کے نشان چھوڑتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

"آج تو چاچا پانچوں گھی میں ہیں"۔۔۔

"کیوں مسخری کرتے ہو بیٹا!"۔ گاڑی جوہڑ کے قریب ہوتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔

"مسخری"

"اور کیا"

"اچھا چاچا ناراض مت ہو۔ ہم گاڑی سے اتر جاتے ہیں"

"نہیں نہیں بیٹا میں نے یونہی کہہ دیا ہے"

"تمہاری مرضی ہے چاچا"۔ ظفر کھڑا ہو گیا۔

"اتنی سی بات کا برا منا لیا"

"بس چاچا۔ مجھے کام ہے۔ یہیں اتار دو۔" "یہیں!" رمضانی نے گاڑی روک لی
"کام ہے یا مجھ سے ناراض ہو گئے ہو؟" "کتنے بھولے ہو تم بھی" ظفر ہنس دیا۔
"کہیں تماشا دیکھنا۔ بھانڈ آئے ہوئے ہیں۔ یہاں اتر کر کیا لو گے؟"
"میں پہلے گھر جاؤں گا۔" "تو کیا ہوا چلو میں تمہیں گھر ہی پہنچا دیتا ہوں۔"
"شکریہ چاچا میں کنوئیں والے راستے سے جاؤں گا۔" "اچھا تو یہ ٹرنک۔"
"ہاں سوٹ کیس گھر پہنچا دینا۔" ظفر سڑک کو چھوڑ کر پگڈنڈی پر ہو لیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد گاؤں کے کچے کچے مکانات اور برگد کا بوڑھا درخت دکھائی دیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا بڑھا۔ پنہاریں کنوئیں پر پانی بھر رہی تھیں ظفر وہاں کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی نگاہیں کچھ ڈھونڈنے لگیں
"بھیا کیا سوچنے لگے ہو۔ پانی پلاؤں؟"
"ارے عیداں" سانولی لڑکی کو دیکھ کر ظفر بولا۔ اور چبوترے پر چڑھ گیا۔ باجے اور شہنائیوں کی آواز آنے لگی۔ پنہارنوں نے لمبے لمبے گھونگھٹ نکال لئے اور کھڑی ہو کر گاؤں کی طرف دیکھنے لگیں۔ چند منٹ بعد گاؤں کی طرف سے بچے شور مچاتے ہوئے آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے گاجے باجے کے ساتھ ڈولی آ رہی تھی۔ اور رمضانی بھاگ بھاگ کر گوٹے چھوڑ رہا تھا۔ "بڑا پیسہ خرچ کیا ہے۔"
"گاؤں بھر کا مالک ہے۔ اسے کیا مشکل۔" "بھاگ کھل گئے۔"
"نور نورانی بن کر رہے گی۔" پنہاریں بولنے لگیں
"نور! یہ تو نے کیا کیا؟" ظفر کا بدن کپکپایا۔ ٹانگیں لرزنے لگیں۔ وہ چکرا کر کنوئیں کی منڈیر سے ٹکراتا ہوا دھم سے کنوئیں میں جا گرا۔ پنہارنوں نے مل کر شور مچایا۔ اور سرِ شام بوڑھے برگد کی شاخوں میں چھپا ہوا الو بول اٹھا۔
"ہیو وہٹ ہیو ہو۔"

ھیرا بائی

کارکنانِ قضا و قدر اجیالے کے مردہ کو سیاہ چادر میں لپیٹ کر دھیرے دھیرے مرگھٹِ مغرب کی طرف لے جا رہے تھے۔ اور دنیا پھٹے پھٹے دیدوں سے دیکھ رہی تھی۔ کھلے میدان میں فوجی خیموں اور چھولداریوں کا لامتناہی سلسلہ حدِ نگاہ تک چلا گیا تھا۔ خیموں کے سامنے بیٹھی ہوئی سپاہیوں کی ہنس مکھ ٹولیاں ہلکے ہلکے قہقہے لگا رہی تھیں۔ اور انگوری رنگ پر دھیمی دھیمی چاندنی میں لاکھوں ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

شہزادہ اورنگ زیب کے خیمے میں لمبی لمبی موم بتیاں روشن تھیں۔ وہ کاغذات دیکھنے میں مشغول تھا۔ اور سینکڑوں چھوٹے بڑے کاغذات کے پرزے چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔

ٹھنڈی ہوا کا ایک سودائی جھونکا پہرے دار کی نظروں سے بچ کر خیمے میں گھس آیا۔

جلتی ہوئی شمعیں کانپ اٹھیں اور ان کے پرتو شہزادے کی نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ "تو ہی معبود ہے۔" تکان سے چور شہزادے نے انگڑائی لی اور قلم ایک طرف رکھ کر کچھ سوچنے لگا۔ "لاحول ولاقوۃ" شہزادے نے پے در پے کئی جمائیاں لیں۔ اور قاز کے پر کا بنا ہوا قلم اٹھا کر پھر دستخط کرنے میں محو ہو گیا۔

"حسن خاں!"

"عالی جاہ" فارسی تو مند بڈھے نے اندر داخل ہو کر ادب سے سلام کیا۔

"مرشد قلی خاں سے کہو کہ ما بدولت علی الصبح یہاں سے کوچ فرمائیں گے۔ ہمارا رسالہ تیار رہے۔"

"آقا۔" تنو مند بڈھا جھک کر پیچھے ہٹتا ہوا خیمہ سے نکل گیا۔

فلک بریں پر شاہد مشرق کی آمد کے چرچے تھے۔ طیور خوش الحان طرح طرح کے نغمے الاپ رہے تھے۔ اور افقِ مشرق کے ٹھنڈے چشمے سے سنہرا پانی ابل رہا تھا۔ شہزادہ اورنگ زیب اپنے جانباز اور وفادار رسالے کے ساتھ بل کھاتی ہوئی سڑک پہ گورنر کی حیثیت سے دکن کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مرشد قلی خاں سیاہ گھوڑے پر شہزادے کے پہلو میں چل رہا تھا۔ رسالے کے صیقل شدہ ہتھیار اندھیارے اور اجیالے کو گلے ملتا دیکھ کر خشمگیں نگاہوں سے انہیں ڈرا رہے تھے۔ اور شاہی نشان فضا میں لہرا رہا تھا

"مرشد!"

"آقائے مہربان!" گھوڑے پر ہی سر کو تھوڑا سا خم دے کر مرشد قلی خاں نے جواب دیا۔

"آؤ! ایک دوڑ لگائیں۔ دیکھیں تو سہی کون بازی لے جاتا ہے۔"

"شہزادے ۔۔ا گستاخی معاف ۔ہم سے آپ نہیں جیت سکتے ۔گو شہسواری میں آپ کو ملکہ حاصل ہے اور شہنشاہ شاہ جہاں کے ماہر ہاتھوں نے آپ کو سنوارا ہے ۔ لیکن خادم بھی آپ کے زیر سایہ ۔۔"

"یہ تو وقت ہی بتائے گا مرشد!" شہزادے نے ہنس کر اپنے سفید گھوڑے کو تھپ تھپایا ۔

"تو ہشیار ۔" شہزادہ اور مرشد نے گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں ۔ ٹاپوں کی آواز بلند ہوئی ۔

سورج کی آڑھی ترچھی کرنیں چپ چاپ ایک دوسرے سے الجھتی ہوئی دنیا والوں پہ سروں کے بل گر رہی تھیں ۔ دو گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے ۔ اور باقی رسالہ ان کی پیروی کر رہا تھا ۔

"آؤ نہ خان ۔۔" شہزادے نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں

"بس شہزادے ہمارا سانس پھول گیا" مرشد قلی خاں بھی قریب آگیا ۔

"اتنی جلدی ۔شکست کا اعتراف کر لیا ۔حالانکہ تم نے دعوے کیا تھا کہ ہم نہیں جیت سکیں گے ۔"

"معافی چاہتا ہوں ۔" خان نے ادب سے اپنا سر جھکا دیا ۔

"دیکھا خان ۔ایک ہی دوڑ میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ۔یہ گھوڑوں کی دوڑ نہ تھی ۔ بلکہ ہمارے مستقبل کا ایک ہلکا سا خاکہ تھا ۔"

"جی حضور ۔"

"یاد رکھنا ہم انشاء اللہ اسی طرح ۔" کچھ سوچ کر شہزادے نے بات کا ۔ خ ہچ

اور بولا۔

"ہم نازونعم میں پلے ہوئے ضرور ہیں خان۔ لیکن یہ مت بھولو۔ یہ زندگی ایک جفاکش مجاہد کی زندگی ہے۔ ایک باعزم مسلمان کی زندگی ہے۔"

"جی حضور"

"ہم لہو لعب کے شیدائی نہیں۔ لاابالی پن سے ہمیں دکھ ہوتا ہے۔ بس تم اتنا ہی سمجھ لو کہ ہماری زندگی اس مومن کی حیات ہے جو حق پہ قربان ہونے کے لئے پیدا ہوا ہے۔"

"جی حضور۔" مرشد شہزادے کے بولنے پر 'جی حضور' کہہ کر خاموش ہوجاتا تھا۔

"آؤ مرشد! ایک دوڑ اور ہوجائے۔"

"جی حضور۔ نہیں نہیں حضور" مرشد نے جلدی جلدی اپنا ہاتھ ہلایا۔

"تمہاری مرضی۔" شہزادہ ہنس دیا اور خاندانِ تیموری کی دودھیا ہنسی جنوبی فضا میں چمکنے لگی۔ اس عرصے میں دوسرے سوار بھی پہنچ گئے۔ شہزادے نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تمام رسالہ قطار در قطار آہستہ آہستہ دوڑنے لگا۔

یہ بُرہان پور کی ایک مہکتی ہوئی شام تھی۔ مغرب میں سرمئی رنگ کا ایک بڑا سا بادل آسمان سے پیٹھ لگائے، سورج کو اپنی جھولی میں ڈال کر آرام سے پاؤں پھیلائے سمٹتا رہا تھا۔ اور فرشتے سنہرے طبق کو دنیا کے گوشے گوشے میں تلاش کر رہے تھے۔

شہزادہ اورنگ زیب بابری جلال کے ساتھ باغیچۂ زین آباد میں ٹہل رہا تھا۔ بھینی بھینی باس، بھیگی بھیگی نکہت اور سوندھی سوندھی خوشبو، رنگا رنگ کے چھوٹے بڑے پھولوں میں پرشباب اپسراؤں کی مانند انگڑائیاں لے کر بیدار ہورہی تھی۔ اور شہزادے کے معطر جسم کو سونگھنے کے لئے اس کے گرد منڈلا رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے

کے بعد ٹھنڈی اور مست پون کے ہلکے ہلکے عطر بیز گستاخ جھونکے دریائے تاپتی کو پار کر کے آتے اور شہزادہ کے رعب و داب کی پرواہ کئے بغیر اس کے شاہی لباس کو چھو کر فضا میں غائب ہو جاتے۔ شہزادہ محوِ سیرِ چمن تھا۔ کہ اس کے کانوں نے مدھر شہنائی سنی — ایک دھیما سا نسوانی قہقہہ۔ شہزادے کے کانوں کے مضبوط پردوں میں لرزش پیدا ہو گئی اور اسے فضا میں ہزار ہا فردوسی ساز بجتے ہوئے سنائی دیئے۔ میٹھے میٹھے سلونے سلونے ساز۔ شہزادہ کی روح جسم خاکی میں تلملا اٹھی اور جاں لیوا دھڑکنیں خون کی روانی کے ساتھ ساتھ تمام بدن میں پھیل گئیں۔ وہ اور بھی بے قرار ہو گیا۔

چند منٹ کے بعد وہی شیریں کے میٹھے نغموں کا سا ہلکا پھلکا قہقہہ پھر کسی کے نازک لبوں کو چھو کر نکلا اور شہزادہ جھوم گیا۔ اس کی مچلتی ہوئی نگاہیں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگیں۔ بھٹکی ہوئی نگاہوں نے قریب ہی ایک جمیل اور چندرمکھ دوشیزہ کو کنیزوں اور سہیلیوں کے جھرمٹ میں دلوں کو اڑا لینے والی ہنسی ہنستے دیکھا۔ آموں کا موسم تھا۔ کچے اور ہرے ہرے آموں سے ڈالیاں ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ دوشیزہ نے آموں سے بوجھل ٹہنیوں کو دیکھا اور ایک انداز سے اٹھلاتی ہوئی آگے بڑھی۔ دوسری کامنیاں بھی پیچھے پیچھے چل دیں۔ شہزادے کو ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ چاند قدرت کے ساتھ جھگڑ کر ستاروں سمیت گگن سے اُتر آیا ہے۔ آم کی شاخوں تلے پہنچ کر دوشیزہ ٹھہر گئی۔ اس نے لٹکے ہوئے آموں کو دیکھا اور مسکراتی ہوئی توڑنے کے لئے اچھلی۔ مگر ناکام رہی۔ پیشانی پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے سینکڑوں قطرے نمودار ہو گئے۔ دوشیزہ نے ایک ادا سے اپنی جبیں سے پسینہ پونچھا، ور پھر اچھلی۔ مگر اس دفعہ بھی آم کو نہ چھو سکی۔ وہ ندامت سے پیچھے ہٹ گئی۔

کلیاں ننھے ننھے دھنوں کو بھینچے اندر ہی اندر مسکرا رہی تھیں۔ شہزادہ بڑی چاہ سے معرکتہ الآرائیاں دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور مہ پارہ آگے بڑھی اور بے ساختہ اچھلنے لگی۔ مگر آم توڑنے کی بجائے خود چاروں شانے چت گری۔ قسم قسم کے قہقہے حسین لبوں سے پھوٹے اور دوشیزہ ہنستے ہنستے بے دم ہوگئی۔ "آخر ہم ہی یہ مورچہ سر کریں گے۔" وہی دوشیزہ کہتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس نے غور سے لٹکتے ہوئے آموں کو دیکھا اور سیدھ باندھ کر زور سے اچھلی۔ مگر آم تک نہ پہنچی۔ دوبارہ پھر کوشش کی۔ اس دفعہ اس کی حنائی انگلیوں کے پورے کچی کیری کے ساتھ ٹکرا گئے۔ شاخ پر آم جھولنے لگا۔ دوشیزہ کی ہمت بڑھی اور وہ اپنی قوتوں کو یک جا کرکے پوری طاقت کے ساتھ اچھلی۔ معمولی سی آواز پیدا ہوئی اور دوشیزہ آم سمیت زمین پہ گر پڑی۔ سہیلیوں نے قہقہہ مارا۔ وہ بھی مسکراتی ہوئی اٹھی۔ پسینے کے ننھے منے آبدار موتی دوشیزہ کے سندر مکھڑے پر بکھر گئے۔ جیسے لا تعداد گلاب ٹھنڈی صبح کے وقت پوتر اوس میں غسل کرکے ہلکی ہلکی پھیلتی ہوئی دھوپ میں اپنے منہ بے نقاب کئے سوئے ہوں۔

شہزادہ کھو گیا۔ دوشیزہ کا معصوم چہرہ جس پر ملائمت حد درجہ چھائی ہوئی تھی۔ اور اس کی شیریں زبانی شہزادے کے دل میں نشتر بن کر اتر گئی۔ کنیزوں اور سہیلیوں میں گھری ہوئی آم توڑنے کے بہانے، وہ بہادر شہزادہ کا دل توڑ کر لے گئی۔ اس نظارے نے شہزادہ کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اور شہزور شہزادہ جس کا نام لینے سے ہی سورماؤں کے کلیجے ان کی فولاد جیسی چوڑی چھاتیوں میں دہل اٹھتے تھے۔ ایک نازک سی ناری کے ہاتھوں اپنا سب کچھ لٹا کر زخم خوردہ جسم کی طرف چل دیا۔——

پھول ہنس رہے تھے۔

دوسری صبح ہزاروں آرزوؤں کو اپنے جلو میں لیئے ہوئے نمودار ہوئی۔ شہزادہ اپنی خالہ جان کو سلام کرنے کے لئے ان کے عالی شان محل پر پہنچا۔ اور چپ چاپ اندر داخل ہُوا شہزادہ خیالِ یار میں ڈوبا ہُوا تھا۔ کہ اسے گنگنانے کی آواز سنائی دی۔ اس نے دیکھا وہی دوشیزہ دائیں ہاتھ سے درخت کی شاخیں تھامے کسی نامعلوم جذبے کے تحت گنگنا رہی ہے۔ زبان میں کتنی مٹھاس تھی۔ شہزادہ جو پہلے ہی زخم کھائے بیٹھا تھا۔ اس دلفریب اور حسین ساحرہ کے انمول روپ کو دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

شہزادے کی بے ہوشی کی خبر تمام عمارت میں پھیل گئی۔ کنیزیں اور لونڈیاں ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ اس کی خالہ دوڑی ہوئی آئی۔ اور آتے ہی اس سے چمٹ گئی۔

"میرے بچے یہ تجھے کیا ہو گیا۔ بول میرے لعل" وہ رو رہی تھی۔ اور باندیاں عطر گلاب اور کیوڑہ چھڑک رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد شہزادے نے پلکیں اٹھائیں۔

"میرے شہزادے" خالہ کے چہرے پر بہار آگئی۔ اس نے خوش ہو کر بے ساختہ شہزادے کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"یہ کیسا عارضہ ہے؟۔ کیا تم پہلے بھی اس بیماری میں مبتلا ہوئے تھے؟"

شہزادہ کی خالہ نے بار بار پوچھا۔ مگر شہزادہ چپ تھا۔ اور اس کی نگاہیں بھٹک رہی تھیں۔

دوپہر رات ڈھل چکی تھی۔ شہزادہ پلنگ پر گم صم پڑا ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا۔ اور اس کی خالہ چارپائی پر لیٹی ہوئی اس کی بے قراری کو دیکھ رہی تھی۔

"اگر میں اپنا روگ بتلا دوں تو کیا آپ . . . . ؟"

"کیوں نہیں میرے شہزادے!" خالہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں اسے دور کرنے کے لئے اپنی جان تک دے دوں گی۔"

شہزادے نے سب کچھ بتلا دیا۔ اور بولا

"خالہ جان اس کے بغیر جینا گوارا ہی نہیں، قطعاً محال ہے۔ میرا علاج آپ کر سکتی ہیں۔ صرف آپ ـــــ ایسا نہ ہوا تو آپ کسی کو بیٹا نہ کہہ سکینگی۔"

"بیٹا! تم کہو تو خالہ اپنی جان بھی تم پر نچھاور کر سکتی ہے۔ مگر دوشیزہ ـــ گو وہ لونڈی ہی ہے۔ لیکن ـــ ....."

"کچھ بھی ہو۔ آپ خالو جان سے میری سفارش کر دیں۔" شہزادے نے اپنی خالہ جان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"نہیں بیٹا! ایسا غضب نہ کر دینا۔ تمہارے خالو جان بہت ہی تند مزاج اور جنونی قسم کے انسان ہیں۔ وہ میری یا تمہاری تو کیا تمہارے والد کی بھی پرواہ نہیں کریں گے۔"

"خالہ جان کچھ بھی کرو۔"

"بیٹا! تمہیں نہیں معلوم۔ اگر میں نے اس بات کا ذکر ان کے سامنے کر دیا۔ تو وہ اسی وقت اس لڑکی کا سر قلم کر دیں گے۔ اور تمہارے دل کی لگن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لگن ہی بنی رہے گی۔"

شہزادہ مایوس ہو کر اپنے خیمے میں لوٹ آیا۔ دوشیزہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ وہی گلابی مکھڑا۔ پتلی پتلی باہیں۔ معصوم جوانی اور پنکھڑیوں کے ایسے لب، اس کے دل میں طوفان اٹھانے لگے۔

"حیدری ——؟"

"آقائے نامدار۔" ایک نوجوان مغل سپاہی نے اندر آکر اپنا سر جھکا دیا۔

"مرشد قلی خاں سے ہم اسی وقت ملنا چاہتے ہیں۔"

"جو حکم۔" سپاہی اُلٹے قدموں واپس چلا گیا۔

شہزادہ اپنے رازدار مرشد قلی خان کو جو دیوان دکن بھی تھا۔ بلانے کا حکم دے کر خیمہ میں ٹہلنے لگا۔ رنگ رنگ کی شمعیں جل رہی تھیں

"شہزادے۔" مرشد نے خیمہ میں داخل ہو کر سلام کیا اور ادب سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"مرشد۔"

"آقا۔"

"ہم نے تمہیں ایک ضروری کام کے لئے تکلیف دی ہے۔ بیٹھ جائیے۔"

مرشد بیٹھ گیا اور شہزادہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر خیمہ میں اسی طرح ٹہلنے لگا۔

"مرشد!—" شہزادہ مرشد کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"ہم بڑی پریشانی میں مبتلا ہیں۔"

"خاکم بدہن۔" مرشد کھڑا ہو گیا۔ "بیٹھے رہئے۔"

"شہزادے نے مرشد قلی خاں کو تمام واقعات بتلا دئے۔"

"مرشد! اس دوشیزہ کو کسی طرح، کسی بھی قیمت پہ ہمارا بنادو — ورنہ ہم —"

"ہمارا شہزادہ ہزار برس سلامت — اتنے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں — ایسی معمولی لڑکیاں ...."

"خان!"

"آقا"

"ہمارے صبر کا امتحان نہ لو!"

"خادم پر بھروسہ رکھیئے۔ خان اپنی جان بھی دے دیگا۔" مرشد نے کھڑے ہو کر اپنا سر جھکا دیا۔

"ہیں!" کچھ وقفے کے بعد مرشد پھر بولا

"شہزادے کے خالو جان کو سمجھاؤں گا۔ کہ وہ اپنی غلام لڑکی، ہمارے شہزادے کے نکاح میں دے دے۔

"خا۔۔۔۔ن۔؟" شہزادہ غصہ ہو گیا۔

"عالی جاہ"

"تم نے ہمارے دل کو ٹھیس لگا دی!"

"گستاخی معاف ۔۔۔! کیا خادم سے کوئی غلطی ہوئی!" خان نے سر کو اور جھکا دیا۔

"ناقابلِ معاف غلطی۔ تم نے ہماری قابلِ احترام محبوبہ کی شان میں، بدکلامی کی ہے۔"

"خادم معافی کا طلبگار ہے!"

"آئندہ احتیاط کی جائے!"

"ایسا ہی ہوگا شہزادے ۔۔"

"ہاں۔ تم نے کیا سوچا؟"

"یہی کہ خادم میر خلیل کو سمجھائے گا۔ مجھے قوی امید ہے کہ وہ رضامند ہو جائیں گے۔ ورنہ پھر ایک ہی علاج ہے۔" خان مرشد نے پہلو میں سے چمکتا ہوا خنجر نکالا

"خان! جس طرح بھی ہو۔ آسے لے آؤ۔"

شہزادے سے رخصت ہو کر دیوانِ دکن میر خلیل سے ملا۔ اور انہیں حالات کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ شہزادے کے خالو جان میر خلیل پہلے تو پس و پیش کرتے رہے۔ آخر خان کے سمجھانے پر رضامند ہو گئے۔ اور انہوں نے شہزادہ کے حرم کی کنیز چتر ابائی کے بدلے دوشیزہ کو شہزادے کے نکاح میں دے دیا

پھولوں سے لدی ہوئی دوشیزہ، دلہن بن کر شہزادہ کے حرم میں آئی۔ دلہن کے سرخ جوڑے میں چھپے ہوئے بدن سے ابٹن کی مہک آ رہی تھی شہزادہ کے سانسوں میں وہ مہک رچ گئی۔ اور اسے اپنے دماغ میں روح پرور خوشبو بسی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

محلوں کی رونق دوبالا ہو گئی۔ اور شہزادہ اورنگ زیب اپنی محبوبہ کو جان سے زیادہ عزیز رکھنے لگا۔ اس کی ہر خواہش شہزادے کے لیے مقدم تھی۔

ایک دن شہزادہ اور اس کی محبوبہ قریب قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اورنگ زیب اپنے دل کی ملکہ کو دیکھ دیکھ کر مدہوش ہو رہا تھا۔ وہ اپنی گھنی پلکوں کو جھکائے اپنے نصیبہ پر رشک کر رہی تھی۔ محبوب سامنے تھا۔ اس نے پلکیں اٹھائیں۔ دودھ بھرے پیالے جیسے کسی تشنہ لب کے سامنے رکھ دئے ہوں — محبوبہ کچھ سوچ کر مسکرائی اور اس نے آواز دی۔

کئی لونڈیاں دوڑی ہوئی آئیں۔ ان کنیزوں میں سے ایک کنیز کو اس نے کچھ

کہا۔ حکم کی دیر تھی۔ کہ وہ باندی ہاتھ میں پیالہ تھامے ہوئے آئی۔ اور اپنی مالکہ کے سامنے پیش کیا۔ سفید سفید بلور کے پیالے میں سرخ سرخ شراب تھرتھرا رہی تھی۔

"لیجئے ۔۔۔ شہزادے"

"یہ کیا ۔۔۔؟"

"انگور کا پانی"

"بیگم ۔۔۔!"

"میرے شہزادے" محبوب بیوی نے پیالہ اور بڑھا دیا۔

"کچھ پتہ تو لگے"

"شر ۔۔۔ آب"

"شراب" شہزادہ حیران تھا۔

"ہاں شراب"

"لیکن" شہزادے کے ہونٹ نہ کھل سکے۔ اس کی نگاہوں میں التجا تھی۔

"بہانہ نہیں سنا جائے گا"

"مگر"

"میں حکم دے رہی ہوں"

"اچھا" دیوانے اور مجبور عاشق نے محبوبہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھوں میں پیالہ تھام لیا۔ پیالہ ہونٹوں کی طرف بڑھا اور کپکپاتے ہوئے دو لب پیالے کی جانب ۔۔۔ لالہ گوں مے بے چین تھی۔

"میرے دیوانے" محبوبہ نے پیالہ لے کر ایک طرف پھینک دیا اور مسکرا

"میرے اچھے محبوب!۔ میں صرف آزمانا چاہتی تھی۔ امتحان میں پورے اترے ہو"
"سچ" شہزادے نے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔
"میں تمہیں شراب پلا کر گناہوں کے خوبصورت گڑھے میں دھکیلنا نہیں چاہتی"۔
اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ شہزادے کا دل دھڑک رہا تھا۔

خوشیاں اٹھتے ہوئے طوفان کی مانند نمودار ہوئیں۔ اور اسی عجلت سے روپوش ہو گئیں۔ گھنے جنگلات پر سے گذرتے ہوئے بادلوں کی طرح 'بہار نے ایک جھلک دکھائی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خزاں میں بدل گئی۔ چرخ کبود کے کھیل بھی کتنے نرالے ہیں۔ ایک صبح زمانے نے چولا بدلہ اور اپنی پیٹھ پر لدی ہوئی خوشیوں کو رنج و آلام کے تاریک اور گھناؤنے غاروں میں دھکیل دیا۔

شہزادے کی محبوب بیوی کو چاند کی نظر لگ گئی۔ وہ بیمار ہو گئی۔ اور شہزادے کے دل میں آگ لگ گئی۔ سینکڑوں وید، ہزاروں ڈاکٹر اور لاتعداد حکیم و سیانے بلائے گئے۔ لونڈیاں باندیاں کنیز و غلام بل بل دوڑے۔ مگر وہ حسین تصویر جس کے نقش دیوانے دل پر کندہ ہو چکے تھے اور جو کسی زندگی پر ابر بہاراں اور مسرتوں کی اڑتی ہوئی گھٹاؤں کی طرح چھائی ہوئی تھی ہر لمحہ اپنے اختتام کے قریب تر ہوتی گئی۔

"شہزادے"

"بولو ہماری زندگی"۔ شہزادہ صندل کی چھوٹی سی چوکی کھینچ کر پلنگ کے قریب بیٹھ گیا۔ اور اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

"ہمت ہار گئے؟"

"ہم بہت ہی بدقسمت ہیں"۔ شہزادے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

" میرے محسن دیوانے! - لیٹے لیٹے اس نے شہزادے کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر انگلیوں سے آنسو صاف کرنے لگی۔

" اتنا چھوٹا دل - شیر ہو کر یہ رونا - اور ایک عورت کے لئے اپنی جان کو گھن لگانا ایک جری اور ذی شان انسان کے شایانِ شان نہیں"۔

" میری روح!" شہزادے نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"جری اور دلاور انسان بھی انسان ہوتا ہے۔ اس کے پہلو میں بھی وہی دل ہوتا ہے۔ جو ایک کمزور اور بزدل انسان کے سینے میں دھڑکتا ہے۔ تڑپنے والا دل۔ محبت بھرا دل ـــــ تمہیں نہیں معلوم، تمہارے بغیر سبزہ سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں سرسبز و شاداب وادیاں، جھیلیں سیرگاہیں۔ یہ تخت یہ حکمرانی۔ سب سراب بن جائے گی۔ ہماری زندگی میں کچھ بھی نہ رہے گا۔ یہ جوانی جواب تک تمہاری نوازشات کے سہارے مسرتوں کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ ہماری جان پر وبال بن جائے گی۔ ہم جیتے جی برباد ہو جائیں گے۔"

" میں جانتی ہوں کہ تم خادمہ کے دیوانے ہو۔ تمہیں اس ناچیز سے بے حد محبت ہے۔ اتنی محبت کہ شاید گل و بلبل میں بھی نہ ہو۔ چندا اور چکوری بھی اس سے بے نیاز ہوں۔ لیکن قانونِ قدرت ـــ یہ بھی اپنی جگہ اٹل ہے۔ گدا و شاہ سب برابر ہیں۔ اپنے دل کو دھیر بندھاؤ۔ میں نہیں چاہتی۔ کہ میری آنکھیں بند ہوتے ہی لوگ مجھے یہ کہیں کہ ایک ڈائن ہمارے شہزادے کو ہڑپ کر گئی۔ کیا تم یہ سب کچھ برداشت کر لو گے؟ اور سن سکو گے کہ تمہاری محبوبہ اس نام سے پکاری جائے! نوازی جائے؟ ـــ"

مریضہ کے چہرے پر ننھے ننھے قطرات ابھر آئے۔

"ہم ـــــ"

"آخر کب تک؟؟ کس کے لئے۔ ایک عورت کے لئے۔ ـــــ ذرا صبر سے"

مریضہ کے سینے کا اتار چڑھاؤ نمایاں ہوگیا

"وعدہ کیجئے!ـــــ"

"جانِ من"

"میں چند گھڑی کی مہمان ہوں۔ مرنے سے پہلے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں"

"بولو! ہم جان بھی دینے کو تیار ہیں" شہزادہ کھڑا ہوگیا۔

"بیٹھ جائیے۔ میرے قریب"

"شہزادہ بیٹھ گیا اور مریضہ اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ بولی

"مجھے تمہاری جان کی حاجت نہیں۔ پھولو پھلو!! ۔ میری یہی دعا ہے۔ اپنے فرض کو یاد رکھنا! اور مجھے بھول جانا۔ یہ میری خواہش ہے۔ میری محبت یہی چاہتی ہے"

"میرا!!ـــــ"

"خدا حافظ! خدا حافظ!! میرے ساتھی ـــــ میرے ـــ ما ـــ لک"

مریضہ کے لب آہستہ آہستہ ہلے۔ اس کا سر ڈھلک گیا اور آنکھوں میں کب کے رکے ہوئے دو آنسو، گالوں پر سے لڑھک کر شہزادے کی چوڑی کلائی پر گر پڑے

شہزادہ چیخ مار کر بے ہوش ہوگیا اور تمام محلات میں کہرام مچنے لگا۔

لہراتی کھیتیاں ساکت ہوگئیں۔ پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے سبزہ نے زردی کو اپنا لیا۔ اور ـــــ اور حسین وادیوں میں دھول اڑنے لگی۔

موت نے اس رشتہ کو اس وقت ختم کر دیا۔ جب محبت جواں تھی۔ مرحومہ

کا نکھار جوبن پر تھا۔ اور جوانی دھڑکنوں کی بہار کے سایہ تلے پرورش پا رہی تھی۔

جنازہ اٹھا۔ محبوب نے جیون ساتھی سے منہ موڑ لیا۔ اور اپنے حرماں نصیب دیوانے کے کاندھوں پر سوار ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اورنگ آباد میں تالاب کے کنارے جا سوئی۔

پھولوں نے کملا کر اپنی گردنیں ڈال دیں۔ لہروں نے سلامی دی۔ اور ایک عاشق سر جھکائے انسوؤں کی بکھیر کرتا واپس آگیا۔

مرنے والی ہی ہیرا بائی تھی۔ جو کہ محلوں میں آنے کے بعد۔ زین آبادی کہلانے لگی تھی۔

اَبْ دِیا کون جَلائے

"رجو! آؤ نا ذرا شہید کے مزار پر بیٹھ جائیں۔"

"نہیں بوا —— مجھے تو ڈر لگتا ہے۔"

"پگلی! ڈر کاہے کا ——" شمو نے پتھر کے ٹھی ماری اور مغرب میں سمٹتی ہوئی سرخی کو دیکھنے لگی۔

"دیر ہو جائے گی۔" رجو ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ شمو نے منہ پھیر کر اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا

"آ تو سہی۔"

"بوا"

"اری چل بھی۔"

"کوئی بھیڑ گم ہو جائے گی۔"

"تو فکر نہ کر ـــــ" شمّو نے رجّو کا ہاتھ چھوڑ دیا اور لپک کر ایک بھیڑ پکڑ لی۔

"میری لالی بہت اچھی ہے۔ بہت سمجھ دار ہے ـــ" شمّو بھیڑ کے جسم سے اپنے گال کو رگڑتے ہوئے پیار سے انداز میں بولی اور بھیڑ کا منہ چوم کر کھڑی ہو گئی

"چلو!" ـــ رجّو اٹھی۔ دونوں نے پہلے چشمہ سے ٹھنڈا پانی پیا۔ اور پھر شہید کے مزار پر آکر بیٹھ گئیں۔

سرسبز پہاڑیوں کا گہرا سایہ ندی کے سینے پر پڑا ہوا ہلکورے کھا رہا تھا۔ جیسے کوئی کنواری دوشیزہ اپنے ابھار کو دھانی دوپٹے سے چھپائے، پریمی کے خیال میں مگن، بیٹھی ـــ کچھ سوچ رہی ہو۔ مغربی افق میں سونا پگھل رہا تھا۔ شام کے سرمئی سائے ہرے ہرے پیڑوں کی شاخوں پر جھول رہے تھے۔ اور چیل کے درخت حسرت بھری نگاہوں سے بے جان پتھروں کو دیکھ رہے تھے۔ ندی کے ایک کنارے پن کوّے اکٹھے ہو کر شور مچانے لگے اور چھوٹے چھوٹے پرندے ہلکی ہلکی اڑان کے ساتھ آکر ادھر اُدھر بیٹھنے لگے۔

ریاست کے صدر مقام سے آنے والی سڑک ندی کے کنارے کو چھوتی ہوئی پہاڑی کے قریب سے ہو کر اس کے پیچھے جا کھوئی تھی۔ سڑک سے کچھ ہٹ کر پہاڑی کے ساتھ ہی پتھروں کا بنا ہوا ایک کوٹھڑہ تھا۔ جس میں ایک بوڑھا بیٹھا موٹر کے ٹکٹ تقسیم کیا کرتا تھا۔ اور ایک تنگ سی پگڈنڈی وہاں سے ہوتی ہوئی اوپر کو چڑھ رہی تھی جس پر اکا دکا شخص پہاڑی سے نیچے اترتے یا اوپر چڑھتے اکثر دکھائی دے جاتا تھا۔ پہاڑی کے درمیانی حصہ میں چھوٹی سی جگہ کاٹ کر ایک پختہ قبر بنوائی گئی تھی جو کہ قرب وجوار میں شہید کے مزار سے موسوم تھی۔ مزار کے سرہانے ایک طاق بنا

ہوا تھا۔ جس میں ایک پرانا سا دیا بھیگی راتوں میں ٹمٹمایا کرتا تھا۔ مزار پر جھکے ہوئے دو انجیروں کے درخت ایسے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے دو چلتے چلتے مسافر ٹھہر کر فاتحہ پڑھنے لگے ہوں۔ انجیر کے چوڑے چوڑے پتوں کے درمیان ایک بانس سر نکالے ہوئے تھا۔ جس کے سرے پہ مٹیالے رنگ کا کپڑا جھنڈے کی صورت میں بندھا پہاڑی ہوا کے ہاتھوں اور اس اوس بھیگی پھیکی شاموں میں پھڑ پھڑایا کرتا۔ شاخوں پہ بیٹھے ہوئے چھوٹے چھوٹے پرندے چہچہاتے شور مچاتے اور رہگذر کہتے "شہید کی روح بے چین ہے، بے قرار ہے" ——— مزار سے کافی اوپر چڑھنے کے بعد پہاڑی کی چوٹی پر گھاس پھونس کی تنگ و تاریک جھونپڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جن میں بسنے والے آتے جاتے اس مزار پر بیٹھ کر سستاتے قریب سے گزرتے ہوئے ٹھنڈے چشمے کا پانی پیتے اور ایک خلوص سے سوئے ہوئے شہید کو سلام کر کے چلے جاتے ——— شام کی سیاہی پھیلنے سے کچھ پہلے ٹکٹ تقسیم کرنے والا بوڑھا ہانپتا ہوا پہاڑی پر چڑھتا۔ دیے میں تیل ڈالتا۔ اور اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اسے جلا کر کچھ پڑھتا ہوا آہستہ آہستہ نیچے اتر کر اپنی جگہ پر پڑ رہتا۔

"بوا! چپ کیوں ہو؟"

"سن رجّو!"

"یہ تو بنسری ہے۔"

"ہاں رجّو۔ یہ بانسری ہی تو ہے!" شمو نے اپنی جھکی پلکیں اٹھائیں اور آرام سے لیٹے ہوئے شہید کی طرف دیکھا۔ گوالے کی بانسری بے جان پہاڑیوں میں سوز و ساز بکھیر رہی تھی۔ اور چند مرغابیاں ہوا میں چکر لگا رہی تھیں

"چلو نا! اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔"

"پاگل — شہریوں کی طرح ڈرنے لگی ہے۔" شمو دھیرے دھیرے مزار کے ساتھ لگ گئی۔ اس نے مسکرانا چاہا۔

"اب تو جوان ہو گئی ہے۔"

"جوانی ہی میں ڈر لگتا ہے۔ جب میں چھوٹی سی تھی۔ اس وقت تو مجھے پتہ بھی نہ ہوگا۔ کہ ڈر کیا ہوتا ہے۔"

"شریر —" شمو نے رجّو کے سر پر ہاتھ مارا۔ رجّو کی چوڑی پیشانی پر بالوں کی لٹ آپڑی۔

"بوا —!"

"تجھے کیا ہو گیا ہے۔"

"ماں راہ دیکھ رہی ہو گی —" رجّو بالوں کو درست کرنے لگی

"کوئی پوچھتا تو ہے نہیں۔" شمو نے اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دونوں گھٹنے بازوؤں کے حلقہ میں لے لیے اور مزار پر سر رکھ دیا

"پوچھتا کیوں نہیں؟۔ دیکھنا جاتے ہی تل کے لڈو ملیں گے۔"

"اچھا تو یوں کہو۔ لڈوؤں کی آگ لگ رہی ہے — ہم بھی نہیں جاتے —" شمو نے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں

"مذاق چھوڑو۔ اندھیرا چھا رہا ہے۔"

"رجو!"

"نہیں بوا — میں نہیں —" رجو اوپر سے نیچے تک ہل گئی۔

"کتنا سکون ہے یہاں —؟" شمو ہاتھ پھیلا کر قبر کو سہلانے لگی

"کب سے چیخ رہی ہوں۔ کیا ملتا ہے یہاں؟"

"یہاں ۔۔۔ سب ہی کچھ تو ہے"

"میں تو چلتی ہوں۔"

"او رجّو! ۔۔۔" شمو نے آواز دی اور اٹھ کر اس کی طرف لپکی۔

"کیا ہو رہا ہے لڑکی ۔۔۔؟"

"تم ہر روز یونہی کرتی ہو۔"

"کیا ہو گیا۔ ابھی تو چاچا جینا بھی دیا جلانے نہیں آئے۔"

"تو تم جینا کا انتظار کرو ۔۔۔ بیٹھ کر۔"

"اچھا زیادہ باتیں نہ بنا ۔۔۔ چل"

"اللہ میاں سب بھیڑیں پوری ہوں۔"

"تیرا کیوں دم نکل رہا ہے۔" شمو نے گھوم کر مزار کی طرف دیکھا۔ اور پھر دونوں جلدی جلدی بھیڑیں ہانک کر پہاڑی پر چڑھنے لگیں۔

"بوا سو گئیں؟" رجّو رضائی میں دبکی ہوئی شمو کے پاس سکڑی ہوئی۔

"نہیں تو ۔۔۔"

"چپ چپ کیوں ہو؟"

"رجو! جا سو جا ۔۔۔ مجھے تنگ نہ کر، میری طبیعت خراب ہے۔"

"تم تو ہر روز ہی کہا کرتی ہو۔"

"رجو! خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دے۔" رجو اپنے بستر میں گھس گئی۔ اور شمو منہ لپیٹ کر آنسو بہانے لگی۔

"اری کیا کھا رہی ہے۔ مجھے بھی تو دکھا!....." ہلکی ہلکی دھوپ پہاڑیوں پر پھیل گئی شمو نے رجو کو کچھ کھاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں بوا میں نہیں دوں گی۔"

"کیا نہیں دے گی مجھے۔" شمو نے کلائی پکڑلی اور اس کی مٹھی کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی

"میں بھی تو دیکھوں۔"

"رجو نے جھٹکا مار کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور جھٹ سے کوئی چیز منہ میں رکھ لی

"اچھا یہ لڈو اب کھایا جا رہا ہے۔"

"تم نے تو رات ہی کھا لیا تھا۔"

"رات!—" شمو نے اپنی نگاہیں اٹھائیں۔

"ہاں"

"جھوٹی۔"

"میں کیوں جھوٹی۔ ہر روز تو کھاتی ہو۔ اکیلے۔ اکیلے۔"

"اکیلے۔" شمو نے بہت چھپانے کی کوشش کی۔ مگر رجو نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ ہی لئے۔

"بوا— تم تو رونے لگیں۔ میں کچھ نہ کہوں گی۔ کل سے لڈو بھی دے دوں گی۔"

شمو کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسو نکل کر اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ اور وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پتھر پر بیٹھ گئی۔

"بوا۔ کیا بات ہے؟—" رجو بھی بیٹھ گئی

"رجو! —" شمو نے اسے سینہ سے لگا کر بھینچ لیا۔

"بتاؤ تو سہی —"

"کچھ نہیں ۔"

"نہیں بوا —" رجو نے مچل کر اپنا چہرہ اٹھایا۔ اور شمو کی بھیگی ہوئی آنکھوں کو دیکھا شمو پتھر پر سے اٹھ کر چند قدم چلی اور پھر ٹھہر کر چیڑ کے درختوں کی چوٹیوں پر کچھ تلاش کرنے لگی۔ رجو بھی اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔

"بوا —"

"رجو! ایک دفعہ کہہ دیا کچھ نہیں ۔"

"نہیں ۔ میں تو . . . !" رجو نے اپنا پاؤں زمین پر مارا

"کیا پوچھتی ہے تو؟ —" شمو وہاں سے چل دی اور ایک درخت کے نیچے کمر لگا کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں کیا دکھ ہے؟" رجو اس کے پاس بیٹھ کر بولی۔

"دکھ؟"

"ہاں بوا ۔ تمہیں اداس دیکھ کر، میرا دل گھبرانے لگتا ہے ۔"

"میں ابھاگن جو ٹھہری —" شمو کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔

"رجو! دکھ نہیں ۔ یہ پوچھ تیری زندگی میں اب کونسا سکھ ہے ۔ جو باقی رہ گیا ہے —" شمو کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر دوپٹے پر گر پڑے

"بوا ۔ مجھے نہ رلاؤ —" رجو کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اس نے اپنا سر شمو کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ اور اس کے پاؤں کے انگوٹھے پر انگلی مارنے لگی۔

"پگلی! —" شمو نے اسے اوپر اٹھایا

"تو تم بتاتی کیوں نہیں" رجو کی آنکھوں سے آنسو نکل کر شمو کے بازو پر جا پڑے

"کیا بتاؤں؟"

"یہی —" رجو نے شمو کی آنکھوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا

"اپنی اپنی لگن ہوتی ہے رجو! —" شمو تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گئی اور ہتھیلی سے اپنے گالوں کو رگڑتے ہوئے بولی

"میرے بھاگ ہی پھوٹے ہوئے ہیں۔ کسی کا کیا دوش؟ ——

رجو! —— اپنا شہید ہے نا — شہید"

"کہو نا بوا —" شمو کو رجو نے جھنجھوڑا

"کچھ نہیں —" شمو نے پتھر کا ٹکڑا اٹھا لیا اور اسے دوسرے پتھر پر مارنے لگی۔

"میرے سر کی قسم —" رجو نے شمو کا ہاتھ پکڑ کر پتھر کا ٹکڑا پھینک دیا۔ پتھر کا ٹکڑا قلابازیاں کھاتا ہوا ایک گہری کھڈ میں جا گرا۔

"تجھے یاد ہے شہید کی قبر کب بنی تھی؟"

"شہید کی قبر —— پر میں تو ان دنوں یہاں نہیں تھی۔ میرا خیال ہے۔

"یہ بہت دنوں کی بات ہے۔"

"بہت دنوں کی کہاں؟ — صرف چھ مہینے تو ہوئے ہیں۔ تو بھول گئی۔ سارا جہان ہی بھول جائے گا۔ لیکن میں اسے یاد کرتی رہوں گی۔ وہ میری سانسوں کے ساتھ ہے۔ میرا شہید کتنی جلدی روٹھ گیا —— اتنی بڑی سزا — میرے اللہ میں

نے کونسا گناہ کیا تھا؟"

کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں — بادل کی چند ٹکڑیاں سورج کے گرد منڈلا رہی تھیں جیسے کسی جوگی نے پھیرا ڈال رکھا ہو۔

"یوا —؟"

"رجو —" شمو نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا "وہ شہری تھا۔ شہر چھوڑ کر ہماری بستی میں آ گیا۔ نہ جانے کیوں؟ — میں نے اس سے کئی مرتبہ پوچھنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا "شمو! بے وفا انسانوں کی یاد نہ دلاؤ! دکھ ہوتا ہے" میرا شہید بڑا ہنس مکھ تھا۔ چوڑی چھاتی، بھرے بازو۔ پیارا پیارا مکھڑا اور نکھرا ہوا رنگ — وہ جب آتا تو ایسا معلوم دیتا کہ خزاں کے مہینے میں پھول کھل اٹھے ہوں۔ پہاڑیوں پر پربتوں کی اونچی اونچی چوٹیوں سے اکتا کر کوئی دیوتا آ گیا ہو۔ وہ انمول تھا۔ لیکن زمانے کے ڈسے ہوئے کسی ناسور نے اسے اداسیاں سونپ دی تھیں۔ وہ اداس ہی رہتا تھا — میں نے اس کی چپ چپ زندگی سے خوشیاں حاصل کرنی چاہیں — مگر میری تقدیر! — وہ مجھ سے روٹھ گیا — شمشا کا گھر ہے نا ....."

"ہاں"

"پہلے وہ وہیں رہتا تھا"

"اکیلا" رجو نے شمو کے سینے پر سے اپنا سر اٹھایا۔ لیکن شمو نے اس کا سر پھر اپنے سینے پر رکھ لیا

"ہاں۔ بالکل اکیلا — رجو! اس کی زبان میں بڑی ہی مٹھاس تھی۔ وہ بستی والوں

میں جلد ہی گھل مل گیا۔ جیسے مدتوں سے یہیں رہتا ہو۔ بچوں سے اسے بڑا پیار تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے دیکھتے ہی اس کے گرد گھیرا ڈال لیتے تھے۔ وہ ان سے لاڈ کرتا اور کبھی کبھی کوئی چیز بھی دے دیتا۔ بستی والے اس کی عزت کرتے تھے۔ لیکن وہ اس کے باوجود اکثر غائب رہتا۔ اور تمام دن پہاڑیوں میں ادھر اُدھر گھومتا رہتا۔ خبر نہیں اس نے کیا کھو دیا تھا؟ کبھی کبھی چاچا جینا کے پاس جا بیٹھتا۔ تو ان دنوں اپنے نانا کے قصبے میں گئی ہوئی تھی۔ بھیڑیں لے کر میں ہی یہاں آتی تھی۔ ایک دن جب میں یہاں آئی۔ تو بھورے بھورے بادل پہاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر میرے سر پر چھا گئے۔ اور بوندا باندی ہونے لگی۔ بھیڑیں سر جھکا کر ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔

میں نے بھی ایک پیڑ کا سہارا ڈھونڈ لیا۔ بوندیں پڑ رہی تھیں۔ جس درخت کے نیچے میں کھڑی تھی۔ وہ زیادہ سایہ دار نہیں تھا۔ پانی پڑنے لگا۔ میں وہاں سے اٹھی اور نیچے کی طرف اترنے لگی۔ وہ دیکھو وہ رہا درخت" شمو نے اشارہ کیا "کافی سایہ دار ہے۔ بوندوں سے وہاں پناہ لی۔ اور درخت کے ساتھ لگ کر وہاں بیٹھ گئی۔ چند منٹ بعد وہ بھی وہاں آ گیا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ میری طرف اپنی پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ اور دور ندی کے پار اڑتے ہوئے پن کووں کو پیاس بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"شہری —؟"

"اوہ تم —" میرے آواز دینے پر اس نے گھوم کے دیکھا

"تو کیا وہ تمہیں جانتا تھا؟" رجو نے سوال کیا

"جانتا تو نہیں تھا - ہاں اس نے مجھے اس سے پہلے دیکھا ضرور تھا ـــــــ کیونکہ وہ سارا سارا دن یہیں کہیں پھرتا رہتا تھا۔" شمو نے ہاتھ سے اپنے چاروں طرف اشارہ کیا۔

"معاف کرنا! - بوندا باندی ہونے لگی ہے - اس لئے ....."

"کوئی بات نہیں - آئیے بیٹھ جائیے -!" میں کھڑی ہو گئی

"نہیں - نہیں - آپ تکلیف نہ کریں۔"

"کھڑے کھڑے بھیگ جاؤ گے۔"

"اور بیٹھے بیٹھے؟" نہ جانے اس وقت وہ کیوں مسکرا دیا - کتنے صاف دانت تھے اس کے ـــــ جیسے موتی - جیسے پتھر پر گھسائی ہوئی کوئی سیپی -

"بیٹھ جائیے!" میں نے اسے بٹھلا دیا

"آپ کیوں اٹھ گئیں۔"

"ہمارا کیا ہے - ان چیزوں کے عادی ٹھہرے۔"

"اور ہم۔" اس نے میری طرف دیکھا! ـــــ کتنی سادگی تھی ان دو لفظوں میں - میں کچھ بول نہ سکی اور وہ کھڑا ہو گیا -

"اچھا میں بھی بیٹھ جاتی ہوں۔" ہم دونوں بیٹھ گئے - اس نے سر جھکا لیا - وہ چپ تھا - درختوں کے پتوں میں سے چھن چھن کر پانی کا کوئی کوئی قطرہ گر رہا تھا - اس کے بالوں میں اٹکے ہوئے پانی کے موتی بہت ہی بھلے لگ رہے تھے - اور وہ مجھے اچھا لگ رہا تھا - بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے سر کو تھوڑا سا اٹھایا - قریب ہی پڑے ہوئے تنکے کو اٹھا کر تھوڑا تھوڑا توڑ کر

=سامنے پڑے ہوئے پتھر کو نشانے لگانے لگا۔ میں نے کئی مرتبہ بولنے کی کوشش کی۔ لیکن ہمت نہ پڑی۔ تنکے کا آخری ٹکڑا اس نے پتھر پر مارا۔

"یہ آپ کا وطن ہے؟ —" اس نے میری طرف دیکھا

"کیوں؟" جیسے میں اس کے سوال کا جواب دینے کے لئے تیار ہی بیٹھی تھی۔

"بہت ہی پیاری جگہ ہے۔" وہ چپ ہو گیا اور پھر خود ہی بولا

"کیا کرتی ہیں آپ؟"

"بس — یہی —" جیسے کسی نے سہانے خواب سے جگا دیا ہو۔ میں چونکی

"جو کچھ دیکھ رہے ہو۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"وہ سب کچھ تو دیکھ رہے ہو۔" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

"میں بھیڑیں چراتی ہوں۔" میں چپکے سے مسکرا دی

"تو آپ چوری بھی کر لیتی ہیں۔" اس کے بھولے پن پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"چُراتی نہیں - چَراتی ہوں۔"

"پڑھتی کیوں نہیں۔" اس نے دوسرا سوال کر دیا

"بابو جی! پہاڑی لڑکیاں پڑھا نہیں کرتیں۔"

"پڑھا نہیں کرتیں تو کیا کرتی ہیں؟"

"چوری"۔ میں خود ہی کہہ کر زور سے ہنس پڑی۔ وہ بیچارہ شرمندہ سا ہو گیا "میں تھوڑا سا پڑھ لیتی ہوں۔ اور رکھ بھی لیتی ہوں"۔ وہ کچھ بھی نہیں بولا۔

"میں نے اسے کئی بار دیکھا تھا۔ اور اکثر دیکھنے کی آرزو بھی رہتی تھی۔ اس دن تو خبر نہیں کیا بات تھی۔ وہ میرے دل میں گھُسا جا رہا تھا۔ میرے سینے میں میٹھی میٹھی آگ سلگ رہی تھی۔ اور جی چاہ رہا تھا۔ کہ میں ہمیشہ اسے یونہی دیکھتی رہوں۔ پوجتی رہوں۔ اسی طرح رم جھم ہوتی رہے۔ بادل آئیں اور ہمیں کچھ بھی یاد نہ ہو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں پڑ پڑ کر ہمارے جسموں کو یخ کر دیں۔ اور میرا شبید میرے پاس ہی رہے" شمو کہیں کی کہیں جا پہنچی۔ اس کی آنکھوں میں برسات آگئی۔

"بوا ——" رجّو نے اسے جھنجھوڑا

"ہاں رجو —— وہ میرے پاس ہی بیٹھا تھا" شمو نے گلے میں پڑے ہوئے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں

"خبر نہیں اس کے جی میں کیا آئی۔ کہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی قمیص پکڑ لی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ میں اپنی حرکت پر بڑی پشیمان ہوئی۔ اور میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ سنبھل سنبھل کر پہاڑی سے اترنے لگا۔ اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ جیسے وہاں کوئی تھا ہی نہیں"

"اری رجو دیکھ بچہ گر یگا" شمو نے بھیڑ کے بچے کی طرف جو کہ ایک بڑے سے پتھر پر چڑھ گیا تھا' اشارہ کیا۔ اور رجّو قمچی اٹھا کر دوڑی

پہاڑی پہ سے سڑک کا کچھ حصّہ دکھائی دے رہا تھا۔ باقی حصہ ندی کے

آس پاس کھڑے ہوئے درختوں کی آڑ میں کھو گیا تھا۔ موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ اور ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے بگلے اُڑنے لگے۔

"دیکھ بوا! موٹر آئی ہے۔"

"یہ تو روز ہی آتی ہے۔ چل تو بھیڑوں کو اکٹھا کر، گھر چلتے ہیں"

"اتنی جلدی۔"

"ہاں، میرا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ شاید بخار چڑھے گا۔"

"نہ بوا! یوں نہ کہو۔ گھر چلنا ہے تو چلتے ہیں۔" رجّو بھیڑوں کو اکٹھا کرنے لگی۔ اور شمو وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ گئی۔

"آؤ! ـــــ"

"رجّو! ر۔" رجّو شمو کے قریب آگئی۔

"نہ جانے آج میری طبیعت کیوں گھبرا رہی ہے۔"

"دیکھوں تو سہی۔ ارے تمہارا جسم تو آگ کی طرح پھنک رہا ہے۔" رجّو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم شہید کے مزار پر لیٹ جاؤ۔ میں یہاں بیٹھی ہوں"

رجّو کے کہنے پر شمو وہاں سے اٹھی اور شہید کے مزار پر جا کر پڑ گئی۔ اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ لیٹتے ہی آنکھیں بند ہو گئیں۔

"بوا اٹھو بھی ـــ"

"نیند آگئی تھی۔ دیر تو نہیں ہوئی۔" رجّو کے پکارنے پر شمو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر دوپٹہ کو ٹھیک کیا۔

"اب چلنا چاہیئے۔ آہستہ آہستہ چلوگی۔ تب کہیں سورج ڈوبتے تک پہنچوگی۔"

رجّو نے شمّو کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولی

"بخار تو اب نہیں ہے۔"

"بخار ـــ بخار ہی میرے لئے اچھا ہے۔ جس کی وجہ سے میں کچھ دیر تو یہاں پڑی رہی"

"بوا۔ کیسے بول منہ سے نکالا کرتی ہو۔"

"تو نہیں جانتی؟ یہاں کتنا سکون ملتا ہے۔ ہر وقت یہی تمنا رہتی ہے۔ کہ یہیں بیٹھی رہوں۔ ان ہی قدموں میں ـ یونہی ـــ لیکن دنیا یہ بھی نہیں دیکھ سکتی ـــ چل رجّو! ـ" شمّو مزار پر سے اٹھی اور دونوں بھیڑوں کی طرف آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگیں ـ

پہاڑی لوگوں کی جھونپڑیوں میں مٹی کے دیئے ٹمٹمائے اور کہیں کہیں بھیڑیں ممیانے لگیں ـ

"رجّو! ـــ جا اپنی جگہ پر جا کر پڑ جا۔"

"نہیں ماں ـ میں تو بوا کے پاس بیٹھوں گی ـ ان کی طبیعت خراب ہے۔"

"شمّو کیا بات ہے۔" رجّو کی ماں اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی

"کچھ نہیں بھابھی یونہی بخار سا ہو گیا تھا۔"

"ٹھنڈ لگ گئی ہوگی ـــ اسی لئے تو کہتی رہتی ہوں ـ کہ دروازہ جلد بند کر لیا کرو۔"

شمّو کی بھابھی نے جھونپڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ اور اپنے پھٹے پرانے بستر کو درست کرتے ہوئے بولی

"اس کا باپ تو ایسا قصبہ گیا۔ کہ جا کر ہی بیٹھ گیا۔"

"آجائے گا بھابی ۔"

"رجّو دیئے کو بجھا دیو ۔"

"لڈو کھا لو ۔" شمّو کے پاس بیٹھ کر رجّو نے جیب سے تل کا لڈو نکالا

"نہیں رجّو! ۔ تو ہی کھا لے ۔" رجّو نے لڈو واپس جیب میں رکھ لیا ۔ اور رضائی کا ایک کونا اٹھا کر اپنے پاؤں پر ڈال لیا ۔

"بوا! کیا شہید پھر بھی ملا ؟"

"شہید ۔" شمّو دیئے کی طرف دیکھنے لگی ۔ اس کی آنکھوں میں چھپے ہوئے آنسو جھلملا رہے تھے ۔

"وہ کئی دن تک دکھائی نہیں دیا ۔" شمّو رضائی کو اپنی ٹانگوں میں دباتے ہوئے بولی ۔ "ایک دن سورج ڈوبتے ہی بارش ہونے لگی ۔ میں جھونپڑے میں بیٹھی تھی کہ یکایک اس کا خیال آیا ۔ اور میں اٹھی ۔ میں نے ایک رومال میں کئی روٹیاں لپیٹیں اور چپ کے سے نکل کر شہید کے دروازہ پر پہنچی ۔

"بابو جی ۔"

"کون ؟"

"میں ہوں شمّو ۔" میں اندر چلی گئی ۔ وہ مونڈھے پر بیٹھا تھا ۔

"بابو جی سردی ہو رہی ہے ۔ آگ تو جلا لیتے ۔ دیا سلائی کہاں ہے ؟" میں نے سوال کیا اور خود ہی بولی

"یہ رہی ۔" دیئے کے قریب پڑی ہوئی دیا سلائی میں نے اٹھالی اور لکڑیوں میں تلی جلا کر آگ لگا دی ۔

"آپ نے کیوں تکلیف کی ۔"

"تکلیف کاہے کی ۔۔۔ سوچا! شہری بھوکا ہوگا کچھ لیتی چلوں ۔" میں نے رومال میں سے روٹیاں نکال کر شہری کے سامنے رکھ دیں ۔

"دال بھری ہے ۔"

"آپ نے اپنا نام نہیں بتلایا ۔" اس نے روٹی کھانے کی بجائے مجھ سے پوچھا ۔

"شمو!" ۔ اپنا نام ایک نوجوان کے سامنے لینے سے میرا چہرہ سرخ ہوگیا ۔ میں نے گردن جھکا دی اور مونڈھے سے لگ کر بیٹھ گئی ۔

"دیکھو شمو! ۔ مجھے قطعاً بھوک نہیں ۔ ناحق تکلیف کی ۔"

"تکلیف کیسی "

"تکلیف نہیں تو کیا ۔ ایک بدبخت انسان کے لئے پانی میں بھیگتی ہوئی آئی ہو ۔"

"یوں نہ کہو! تم تو دیوتا ہو ۔" میں نے اس کی ٹانگوں پر اپنا سر رکھ دیا اور سب کچھ بھول گئی ۔ وہ دیئے کی لو کو دیکھ رہا تھا

"کیوں گنہگار کرتی ہو ۔"

"اچھا تو یہ لڈو کھالو ۔" میں نے دو لڈو نکال کر اس کی گود میں ڈال دیئے ۔ اور اپنا منہ اس کی ٹانگوں سے رگڑنے لگی ۔

"ضرور کھلانے ہیں ۔" اس نے یہ کہہ کر ایک لڈو اٹھایا اور کھانے لگا ۔

"ہوں " اس نے دوسرے لڈو کی طرف اشارہ کیا ۔ میں بھی کھانے لگی ۔

"تمہارا جی نہیں گھبراتا ۔ اکیلے رہتے ہوئے ۔"

"نہیں " اس نے سر ہلا دیا ۔

"اکیلے رہنے سے نہیں۔ البتہ دوسروں کی موجودگی میں میرا جی گھبرانے لگتا ہے۔"

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا اور پھر بولا۔

"ایسی باتیں نہ ہی کیا کرو تو اچھا ہے۔"

"معافی چاہتی ہوں۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور وہ مسکرا دیا۔

"اب سو جاؤ۔ جا کر۔۔۔"

"نہیں۔" میں نے اس کی ٹانگیں پکڑ لیں

"پگلی!" وہ مونڈھے سے اٹھ گیا۔

"بستر بچھا دوں۔"

وہ کچھ نہ بولا اور میں نے بستر بچھا دیا۔

"زیادہ نہ جاگا کرو۔ صحت کتنی گر گئی ہے۔ کبھی خیال بھی کیا تم نے۔"

"ضرورت ہی کیا ہے۔"

وہ لیٹ گیا۔ میں تھوڑی دیر کھڑی رہی۔ اس کے بعد چلی آئی

"رجو! میں نے اس کے قریب ہونے کی بہت کوشش کی۔ ہر رات میں دیا جلاتی، بستر کرتی اور کافی دیر اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ لیکن وہ اللہ کا بندہ خاموش رہا۔ اس نے کبھی ہنس کر بات بھی نہ کی۔ وہ ہر وقت ہی اداس رہتا تھا۔

"لو! وہ اداس کیوں رہتا تھا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے۔ اسے کسی نے دھوکا دیا تھا۔"

"پوہ کا مہینہ تھا۔ پہاڑی پر ایک چیتا آ گیا۔"

"چیتا" رجّو کے جسم میں کپکپی سی پیدا ہوگئی۔

"تو کیوں ڈرتی ہے" شمو مسکرا دی

"بوا مجھے ڈر لگتا ہے، چیتے سے"

"یہاں کیا چیتا رکھا ہے، جو تو ڈرنے لگی۔ ہاں میں کہہ رہی تھی کہ ایک چیتا کہیں سے آگیا۔ اس نے کئی آدمیوں کو زخمی کر دیا۔ بستی کے لوگ دن میں بھی باہر نکلتے ہوئے ڈرنے لگے۔ کئی دن بھابھی نے مجھے بھی گھر سے نہیں نکلنے دیا۔ بھیا جی بستی کے آس پاس بھیڑیں چراتے تھے۔

ایک دن میں اپنے جھونپڑے کے دروازہ میں کھڑی تھی کہ شہری مجھے سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ میرا خیال تھا۔ وہ مجھ سے بولیگا۔ لیکن وہ نہیں بولا۔ اور میرے پاس سے ہوتا ہوا آگے نکل گیا۔

"شہری" میرے پکارنے پر وہ ٹھہر گیا اور میں لپک کر اس کے پاس پہنچی

"ڈھلوان کی طرف نہ جانا"

"کیوں؟"

"چیتا"

"چیتا۔ مجھے کیا کہیگا وہ۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟" وہ اتنا کہہ کر چل دیا۔ میں کھڑی دیکھتی رہی۔

"رجّو! مجھ ابھاگن کے منہ سے جو نکلا وہی ہوا۔ بالو اور اس کی ماں دونوں آ رہی تھیں کہ چیتے نے انہیں دیکھ لیا۔ وہ پتھروں کی آڑ میں ہوتا ہوا ان کے قریب پہنچا۔ اور جھپٹا۔ شہری وہاں نکل آیا۔ اور چیتے پر خالی ہاتھ ہی ٹوٹ پڑا۔ دو چار آدمی بھی ادھر

اُدھر سے آنکلے۔ لیکن میری تقدیر! ۔ چیتے نے ایسا پنجہ مارا۔ کہ وہ گہری کھڈ میں جاگرا۔ چیتا چھلانگ لگا کر غائب ہو گیا۔

وہ مر گیا۔ لوگ اسے شہید کہنے لگے۔ میرا شہید چلا گیا۔ بستی بھر کو دکھ ہوا۔ رجّو! میں کسی دن ضرور اسے اپنا لیتی۔ لیکن ظالم موت نے کب کسی کے ناسوروں کو دیکھا ہے۔ لوگوں نے اسے پل بھر میں پتھروں تلے چھپا دیا۔" شمو کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔ اس نے رجّو کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

دھیمی دھیمی سی سورج کی روشنی پھیل گئی۔ شمو رجّو کے ساتھ ساتھ بھیڑوں کو لے کر پہاڑی سے اُترنے لگی۔ شہید کے مزار سے کچھ نیچے کافی لوگ جمع تھے۔ شمو انہیں دیکھ کر بولی۔

"رجّو! ۔ تو ذرا ٹھہر میں ابھی آتی ہوں۔" شمو قمچی ہاتھ میں لئے اچھلتی ہوئی وہاں پہنچی۔ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"بوڑھا تھا سنبھل نہ سکا۔"

"بچارے کا پاؤں پھسل گیا۔"

"خبر نہیں کب گرا ہوگا۔"

"رات بھر سردی میں ہی پڑا رہا۔"

"شہید کی بڑی خدمت کی۔"

"مزار پر اب دیا کون جلائے گا؟"

"چاچا جینا کھڈ میں گر کر مر گیا" شمو تیزی سے آگے بڑھی اور چلائی "دیا میں جلاؤں گی۔" سب لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

بوڑھے جینا کو مرے کافی دن گذر گئے۔ دیا ہر رات جلتا رہا۔ شمو آتی اور اندھیرا

پھیلنے سے پہلے آنسو گراتی ہوئی دیئے کی جوت جگا کر چلی جاتی۔

ایک رات شمو گھر نہ پہنچی۔ رجّو اپنے باپ کے ساتھ بھیڑیں لے کر ڈھلوان کی طرف اُتر آئی۔ رجّو اور اس کا باپ جب شہید کے مزار کے پاس پہنچے تو انہوں نے دیکھا شمو اکڑی ہوئی شہید کے مزار پر پڑی ہے۔ اور آنے جانے والے وہاں جمع ہو رہے ہیں۔

ٹوٹی چوڑیاں

گھڑیال نے ٹن سے ایک بجایا

"اف اتنی دیر! بچاری کب سے اکیلی بیٹھی راہ تک رہی ہو گی۔" کامران نے اپنے دوستوں کو شب بخیر کہتے ہوئے بیرونی دروازہ کی کنڈی چڑھا دی اور دبے پاؤں صحن کو پار کر کے سیڑھیوں پر سے چڑھتا ہوا، تیسری منزل پر پہنچا۔

آسمان پر دور دور تک ستارے بکھرے پڑے تھے۔ کمرے کے روشندانوں میں سے چمکتے ہوئے قمقمے کی تیز روشنی چھن چھن کر اندھیاری رات میں آڑے ترچھے زاویے بنا رہی تھی۔

"میں آسکتا ہوں" کمرے میں داخل ہوتے ہی کامران نے آہستہ سے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ پلنگ کی سفید چادر پر بیٹھی ہوئی دلہن سمٹ گئی۔ چھن ن ن۔ چوڑیوں کی لطیف آواز کمرے میں پھیلی اور دلہن نے حنائی ہاتھ اٹھا کر اپنے منہ پر

لٹکا ہوا گھونگھٹ اور نیچا کر لیا۔

"لو جی ہمارا تو آنا بھی ناگوار گزرا کسی کو۔۔۔ اتنی کچھ ادائی ۔میری تقدیر بن کر آئی ہو تو تقدیر ہی بنی رہو۔۔! منہ پھیرنے کی حاجت نہیں ۔میں جانتا ہوں تم کس سوچ میں بیٹھی ہو۔ تم مجھ سے ناراض ہو۔ اور ہونا بھی چاہیے۔ لیکن تم بتاؤ! میں کیا کرتا؟ ۔وہ ہے نا وہ ۔اپنا حامد۔ آج تو کچھ اس طرح ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ ایک بجنا ہی دکھائی دیا۔ تمہاری قسم! اب بھی بڑی منتوں کے بعد مشکل سے پیچھا چھڑا کر آیا ہوں۔ بھلا آدمی اٹھنے ہی نہیں دیتا تھا۔"

۔۔۔ کامران دلہن کے پلنگ پر بیٹھ کر آہستہ سے اس کی طرف کھسکا۔ "حامد نے تمہیں سلام بھی کہا ہے۔" کامران کے بولنے پر دلہن جواب دینے کی بجائے پلنگ کے ایک کونے پر گٹھڑی سی بن کر سمٹ گئی۔

"پتہ نہیں یہ لوگ دوسروں کی مجبوریوں کو کیوں نہیں سمجھتے؟ ۔تم ہی بتاؤ! یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟" کامران سرکتا سرکتا دلہن کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ وہ قریب آگے جگہ نہ ہونے کی وجہ سے وہیں چھوئی موئی بن کر رہ گئی۔ اور اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔ "یوں منہ نہ موڑو! ۔میں تو اس تشنہ لب کی مانند ہوں۔ جو بھولے سے بحر کے کنارے آ کھڑا ہے۔

جانتی نہیں؟ میں نے تمہیں ایک دنیا کے سامنے اپنا جیون ساتھی تسلیم کیا ہے بولو! ۔میری تقدیر۔ صرف ایک دفعہ۔ میں بیگانہ نہیں یگانہ ہوں۔ قدرت نے تمہیں مجھے سونپا ہے۔ میں لٹیرا نہیں، تمہارا رکھوالا ہوں۔ ادھر دیکھو! ۔میری طرف اس طرف۔ نہیں دیکھتیں، آخر کب تک؟ کیا سنا نہیں؟

حجابِ نو عروساں دو بر شوہر نمے ماند
اگر ماند شبے ماند شبِ دیگر نمے ماند

"بس بھئی اب زیادہ نہ شرماؤ" کامران نے شعر کہنے کے بعد مسکرا کر اپنی دلہن کا لمبا گھونگھٹ اپنے ہاتھوں سے الٹ دیا۔ دلہن نے شرما کر اپنا منہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اور ایک ہاتھ سے دوپٹہ اٹھا کر سر پر ڈال لیا۔

"آخر یہ بے رخی کیوں؟ ۔ کیا تم نے مجھے اپنی قسمت کا شریک نہیں بنایا؟"
کامران پلنگ پر سے اٹھا اور پلنگ کی پٹی پر اپنے دونوں ہاتھوں کا زور ڈال کر اپنا منہ دلہن کے بالکل قریب لے آیا۔ یہاں تک کہ دلہن کا سنہری تاروں سے مزین دوپٹہ اس کے لبوں کو چھونے لگا۔ اس کے لب ہلے اور دوپٹہ پھڑپھڑایا۔

"تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی؟ قسم ہے اس سرخ سرخ سے آنچل کی جو میری برباد حسرتوں کے لہو میں ڈوب کر بھی خوش رنگ نظر آرہا ہے۔ میرے دل کی سرخی اپنے میں سموئے۔ حسین صبح اور ملیح کے حسین ملاپ کو ـــــ اس نو دمیدہ مکھڑے کو مجھ سے چھپائے، ارمانوں بھری سیج پر بیٹھی ہوئی سہاگن کے سہاگ کو سینے سے لگائے پڑا ہے۔ اگر تم نے بھی کسی دل کے ساتھ کوئی رلا دینے والا کھیل کھیلا ہے۔ اور ان مست پلکوں کے سائے میں کسی کو سستانے کی دعوت دے کر تم اپنے الفاظ سے پھر گئی ہو۔ یا ظالم سماج کے بہرے کانوں نے تمہاری دبی دبی سسکیوں کو نہیں سنا ہے۔ تمہیں ایک اجنبی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ اور میں نے کسی کے سپنوں کو ریت کی دیوار کی طرح اچانک بیچ میں آکر زمین سے ہم کنار کر دیا ہے۔ تو میں نے دو جیالوں پر برملا جور کیا ہے۔ میں پاپی ہوں۔ مجھے اپنی صورت بھی تمہیں نہیں دکھلانی چاہیئے۔" کامران نے اپنا منہ دوسری

طرف پھیر لیا۔ دلہن نے شرماتے شرماتے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کامران کے کاندھے پر رکھ دیا
" میری غزالہ! ۔ اب اسے پرے پھینکو۔" کامران نے مڑ کر دلہن کی طرف دیکھا۔
اور اس کے سر پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔

" میں اپنی تقدیر پر شاکر ہوں"۔ دلہن کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کامران بولا۔ " اللہ کا ہزار ہزار احسان ہے۔ کہ اس نے میرا حق' اس چمکتے ہوئے چاند کی شکل میں بن مانگے میری جھولی میں ڈال دیا ہے۔" کامران دلہن کے قریب بیٹھ گیا اور دلہن اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے اس کی گود میں گر پڑی۔ ابٹن کی مہک کامران کو پاگل بنا رہی تھی۔

آج کی رات سہاگن کی زندگی میں سب سے پہلی رات ہے۔ اور یہ رات ایک دلہن کے مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔ ان گھڑیوں میں وہ نازک نازک مہندی رچے ہاتھوں سے اپنے دامن میں وہ کچھ سمیٹ لیتی ہے۔ جسے حوا کی ہزارہا بیٹیاں' اپنی بے حیائی اور بدچلنی کے سبب زندگی بھر بھی حاصل نہیں کر سکتیں۔ اور ہمیشہ ترستی ہی رہتی ہیں۔

میری ناہید! آج کی رات ہماری زندگیٔ نو کی اوّلیں رات ہے۔ آج دو تھکے ہارے مسافر گرتے پڑتے اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ کھنڈرات میں بھٹکنے والی دو روحیں کنجِ عافیت میں آرام سے آ بیٹھی ہیں۔ یا یوں کہئے۔ دو قسمتوں نے ایک تقدیر کا روپ دھار لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے جیون کا یہ نیا دَور اس گھڑی سے شروع ہو۔ جب ہم آپس میں معاہدہ کریں اور اپنے دلوں کو یگانگت کی سرخی سے سرخ رُو کریں۔ آج کی رات جو کچھ میرے دل میں چھپا ہے۔ میں تمہیں بتلا دینا چاہتا ہوں۔ اس

سے پہلے میرے دل کی لگن دل میں تھی ۔ لیکن اب تم میری ہر چیز میں برابر کی شریک ہو۔ اور تم سے کوئی چیز چھپانا اپنے ضمیر سے غداری کرنا ہے ۔ میری افسردہ دھڑکنیں میرے بیمار دل کی غمازی کر رہی ہیں ۔ ایسے میں تم بھی مجھے وہ داستان سناؤ ۔ جس کا ہر بول تمہارے درد کا ساتھی ہو ۔ اور میرے زخموں کے لئے نوشدارو ۔" اٹھو! بیٹھ جاؤ" کامران نے اپنی دلہن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا ۔ جس پر گتھی ہوئی زلفیں کالی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئیں یک جا ہو کر دلہن کے گداز سینے کے نیچے جا چھپی تھیں ۔

" پہل میں کرتا ہوں" کامران نے دلہن کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اپنے برابر بٹھا لیا ۔ اور دلہن نے پھر اپنے منہ کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا ۔

" بس بھئی اب بہت ہو چکی ۔" کامران نے دلہن کی کلائیاں پکڑ کر اپنی طرف کھینچیں ۔ گوری گوری کلائیوں میں ٹھنسی ہوئی کالی چوڑیاں کھنکیں اور دلہن کا چہرہ عریاں ہو گیا ۔

" ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آغاز میں کرتا ہوں ۔ تاکہ تمہاری جھجک بھی کھل جائے اور تم مجھے ان خوش رنگ پھولوں کے بارے میں بتا سکو جن کو تم نے ڈوری الفت میں دھڑکنوں سے گوندھ کر نرم کلیجے میں غیروں اور اپنوں سے چھپایا ہے ۔ تم بیدھڑک پھولوں میں چھپا ہوا وہ کانٹا نکال کر میرے سامنے رکھ دو ۔ جو کہ تمہاری روح کے سینے میں پیوست ہے ۔ اور تمہیں بے چین کئے ہوئے ہے ۔ میں خاوند کے لفظ کو بے جا استعمال نہیں کرونگا بلکہ ایک حقیقی اور سچے دوست کی طرح ہمدردی جتاؤں گا ۔ اور اپنے ہونٹوں سے وہ جگہ چوس کر اس درد کو اپنے دل میں چھپالوں گا ۔ میں جابر نہیں میرے ساتھی! مظلوم ہوں اور جانتی ہو ۔ مظلوم کبھی جابر نہیں ہوتا ۔ یہ دیکھو!" کامران نے اپنی جیب میں ہاتھ دیا اور کوئی چیز نکال کر مٹھی دلہن کے سامنے کھول دی ۔ دلہن نے اپنی بھاری پلکیں اٹھائیں

اور چپ رہی۔

"شرماؤ نہیں۔ جواب دو! ۔ پہچانتی ہو۔ یہ کیا ہیں؟"

"ٹوٹی چوڑیاں" دلہن نے قسم توڑی اور اپنے پنکھڑیوں جیسے ہونٹ کھولے

"ہاں ٹوٹی چوڑیاں ۔۔ دیکھنے والوں کی نگاہوں میں کانچ کے ٹوٹے ہوئے ۔۔ بیکار ٹکڑے ۔۔ لیکن جانتی ہو! یہ ٹکڑے میری پھوٹی قسمت کے وہ بکھرے ہوئے ٹکڑے ہیں "جو یکجا تو ہیں ۔ پر یک جان نہیں ۔ یہ ٹوٹی چوڑیاں میری سوگوار زندگی کا پرتو ہیں اور اس کھوئے ہوئے ماضی کا دھندلا سا عکس ہیں ۔ جب محبت جوان تھی ۔ اور ان سمجھ پتنگا بھڑکتی ہوئی شمع کے گرد چکر لگا رہا تھا ۔ لیکن اب یہ ٹکڑے میری اس روح کو جو کہ ہوا میں بہتے ہوئے بھولے سے یہاں آگئی ہے ، کالے ناگوں کی مانند ڈستے رہے ہیں ۔ اور اپنے نوکیلے سروں سے ماضی کے لگائے ہوئے زخموں کو کرید کرید کر اور بھی گہرا کئے جاتے ہیں ۔ میں اس کے باوجود انہیں سینے سے لگائے ہوئے ہوں ۔ پانچ سال سے یہ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں" "پانچ سال کے نام پر دلہن نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھائیں ۔ ان کا سایہ دلہن کے عارضِ تاباں پر سے پھسلتا ہوا کامران کے دل پر پڑا اور لجائی ہوئی دلہن نے کامران کی جانب دیکھا ۔

" یہ ٹکڑے کبھی تمہاری جیسی دیوی کی باہوں کی زینت تھے ۔ اور ان نازک سانولی کلائیوں میں اکثر کھنکتے تھے ۔ جو میری گردن کے گرد بارہا ہالہ کئے رہتی تھیں ۔ لیکن آج وہی کلائیاں کسی اور گردن کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں ۔ اور یہ ٹکڑے میرے جگر کا خون پی پی کر میرا ہی مذاق اڑا رہے ہیں ۔

میری تقدیر! تم نے تو کسی کے ساتھ ایسا نہیں کیا ہے؟" کامران نے دلہن کی طرف

سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ بولو!۔ اگر تم نے بھی ایسا کیا ہے تو تم —" کامران اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اور اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ دلہن چپ چاپ کامران کی گود میں گر پڑی اور پھر جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر انگوٹھے کامران کی آنکھوں پر رکھ دیئے اور محبت سے تھوڑا سا دباؤ ڈال کر پلکوں میں اٹکے ہوئے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ لئے۔

"آج کی رات سہاگ رات ہے دیوی۔ یہ مت خیال کرنا کہ یہ فرط و انبساط کی سہانی گھڑیاں روتے دھوتے کٹ رہی ہیں۔ اور فضول آنسوؤں کے دھارے بہہ رہے ہیں۔ یہ طربناک لمحے بے کار بہے نہیں جا رہے۔ بلکہ ایک ہارا اور زندگی سے تھکا ہوا انسان اپنے رستے ہوئے ناسور دکھلا رہا ہے۔ شاید ان ناسوروں کو دیکھ کر تمہیں رحم آ جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ان کی بہتی ہوئی غلاظت تمہارے دل میں نفرت پیدا کر دے اور تم گھاؤ بھرنے والی مرہم کی بجائے زہریلا نشتر بن جاؤ۔ اب یہ میری قسمت ہوگی تم دردو بنو یا دوا۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے۔ آج میری وہ رات ہے۔ جس کے کسی لمحے میں میری تقدیر کے فیصلے پر اٹل مہر لگتی ہے۔" کامران کی آواز بھرا گئی۔ "مجھے کوڑھی سمجھو۔ یا اپنا حبیب سمجھ کر سینے سے لگا لو۔ تمہیں اختیار ہے۔"

دلہن نے اپنا مہکتا ہوا سر کامران کے سینے پر رکھ دیا۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دھیرے دھیرے اپنے گالوں پر پھیرنے لگی۔

"میں مجرم ہوں تمہارا بھی اور سماج کا بھی۔" کامران نے اپنا دایاں رخسار دلہن کے سر پر رکھ دیا۔ اور خاموش ہو گیا۔

"میں مجرم تو ضرور ہوں"۔ اس نے سکوت کو پھر توڑا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قابلِ

رحم بھی ہوں۔ میرا گناہ وہ گناہ نہیں جس کی تلافی نہ ہو سکے۔ اور میں وہ انسان نہیں جس کا جیون سنبھل نہ سکے۔ میں بد قسمت بھی ہوں اور بے قصور بھی۔ میرے ساتھ ظلم بھی ہوا ہے۔ اور میں مجرم بھی گردانا گیا ہوں۔ دیکھئے یہی تقدیر ہے۔ اور اسے ہی قسمت کہتے ہیں۔ لیکھ کا لکھا کبھی نہیں مٹتا۔" کامران نے اپنی بند مٹھی میں چوڑیوں کے ٹکڑوں کو محسوس کیا۔ اور وہ ہاتھ دلہن کے دامن میں ڈال کر اپنا سر اٹھا لیا۔

" ان دنوں کی بات ہے۔ جب تصور بھی تمہارے دماغ میں نہ ہوگا۔ میں بہت ہی ہنس مکھ اور کھلنڈرا لڑکا ہوا کرتا تھا۔ پر اتنا بھی نہیں کہ اپنی تعلیم کو پس پشت ڈال دیا ہو چڑیاں مارنا میرا کام نہیں تھا" چڑیوں کے نام پر دلہن چپکے سے مسکرائی۔

میرے دوست میرے پاس آکر عجیب عجیب باتیں سناتے اور اپنے عشق کی حکایات گرما گرم لہجوں میں بڑھ چڑھ کر بیان کرتے۔ ان کی میٹھی میٹھی داستانوں سے میرے دل میں دھیمی دھیمی آگ سلگ اٹھی۔ اور میری اس آگ کو ان کی زبان سے عجیب پیرائے میں ادا کئے ہوئے رومان پرور قصے آہستہ آہستہ ہوا دینے لگے۔ جیسے آوارہ ہوا کے راہ سے بھٹکے ہوئے ہلکے ہلکے جھونکے تاریکی کے کلیجے میں سلگتی ہوئی اس مسافر کی آگ کو آ آکر بھڑ بھڑا رہے ہوں۔ جو رات کے اندھیارے میں، سنسان جنگل میں کھڑی ہوئی، چند کالی کالی بے برگ و بار جھاڑیوں کے درمیان، ٹوٹے پھوٹے تنکوں میں آگ لگائے منزل سے کوسوں دور اکیلا بیٹھا ہو۔ اور وہ دور سے دیکھنے والوں کو اس طرح نظر آتا ہو۔ جیسے غولِ بیابانی یا کوئی چھلاوہ جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر آ بیٹھا ہو۔

میرے پرسکون سینے میں، وا ہی گدگدیاں لینے لگا۔ اور راتوں کو عجیب عجیب سپنے آ آکر نیندوں کو اچاٹ کرنے لگے۔ میری نیند کی ماتی آنکھیں اکثر ستاروں کے جھرمٹ میں

گھرے ہوئے چاند کے دل میں اکیلی بیٹھی بوڑھیا کو چرخہ کاتتے ہوئے دیکھتیں اور نیم کا درخت جھومتے ہوئے اپنی شاخوں کو پھیلا کر اس کی پاسبانی کرتا۔

"تم تھک تو نہیں گئیں۔ لیٹ جاؤ!" کامران نے اپنے ہاتھ سے دلہن کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اور اپنا منہ اس کے لبوں کی طرف بڑھایا۔ لیکن کچھ سوچ کر پھر ٹھہر گیا۔ دلہن نے اپنا سر دوبارہ کامران کے سینے پر رکھا اور تھوڑا سا دباؤ دیا۔

"میں جلد ہی اجاڑ اور بھیگی بھیگی راتوں سے پریشان ہو گیا اور آہوئے صحرا کی مانند ادھر ادھر کودتا پھاندتا پھرنے لگا۔" کامران نے دلہن کے منہ پہ اپنا بایاں ہاتھ رکھ دیا۔ اور اپنی انگلیوں سے اس کے پتلے پتلے ہونٹ محسوس کرنے لگا۔

میں ہزار پھرا۔ لاکھ گھوما۔ مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ رات کو سونے سے پہلے جب میں بستر پہ پڑ جاتا۔ تو مجھے دن بھر کی حرکتیں یاد آتیں۔ اور میں اپنے کئے پر بہت پشیمان ہوتا۔ اپنے آپ کو کوستا۔ دن میں اپنی آگ کو لوریاں دے دے کر سلاتا اور وہ تمام دن سونے والے بچے کی مانند آدھی آدھی رات کو اٹھ کر پھر رونے لگتی اور میں زچہ کی طرح اس کو تھپک تھپک کر سلانے کے لئے اٹھ بیٹھتا۔" دلہن دھیرے سے مسکرائی اور اس نے اپنے ہونٹ کھول کر آہستہ سے کامران کی لبوں سے کھیلتی ہوئی انگلی کو کاٹ لیا۔ کامران نے جلدی سے انگلی ہٹا لی اور ہنس دیا۔

"اسی رسہ کشی میں جب دن گذرتا تو رات آتی اور جب سورج زمین کے سینے میں در آتا تو چندا خنک کرنوں کا تاج پہنے مسکراتا ہوا تختِ فلک پر بیٹھ جاتا اور ننھے منھے تارے مودب درباریوں کی مانند ہاتھ باندھ کر اس کے حضور میں کھڑے ہو جاتے

ایک دن کتابوں کو سینے سے لگائے میں سیٹی بجاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ میرے اندر

قدم رکھتے ہی کسی نے اپنے منہ پر لمبا گھونگھٹ ڈال لیا۔ اسی طرح جیسے کچھ دیر پہلے تم بیٹھی ہوئی تھیں" کامران دلہن کے سر میں کھنچی ہوئی مانگ میں انگلی پھیرنے لگا۔

"کوئی نہیں یہ تو میرا بچہ کامران ہے۔ کالج سے آیا ہے" میری والدہ نے گھونگھٹ والی کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہنے لگیں "جا بیٹا! کھانا باورچی خانے میں رکھا ہے ــــ کھالے۔ دیکھ تمام کھانا خراب نہ کر دینا، ابھی تیرے چھوٹے بھائی اور بہن سکول سے نہیں آئے۔"

میرا دل اٹھتی ابھرتی لہروں کو دباتی ہوئی، مسافروں سے بھری ہوئی نیّا کی طرح سینے میں ڈولنے لگا۔ میں نے کنکھیوں سے گھونگھٹ میں چھپی ہوئی دوشیزہ کی طرف دیکھا اور باورچی خانے میں گھس گیا۔ والدہ اس سے باتیں کرنے لگیں۔"

کامران نے سر پر سے ہاتھ اٹھا کر دلہن کی بھری ہوئی پیٹھ پر رکھ دیا اور اس کی کمر پر پڑی ہوئی گھنی زلفوں کو اپنی مٹھی میں لے کر بھینچنے لگا۔

کھانا تو کیسا میرا دل پہلے ہی زور زور سے دھڑک رہا تھا مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر پوری ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ جلدی جلدی دو چار لقمے حلق سے نیچے اتارے اور چپ چاپ باورچی خانے کے دروازہ میں چوروں کی مانند آکھڑا ہوا۔ والدہ کے پاس وہی وہ دوشیزہ سر پر برقعہ ڈالے کھڑی تھی۔ اس کا منہ کھلا تھا۔

سانولا سلونا نکھرا جس پر جوانی مستی میں آئی ہوئی جنگلی کبوتری کی طرح لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ میں اس کو آتا دیکھ کر تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا وہ بیرونی دروازہ پار کرنے کے لئے باورچی خانے کے سامنے سے گزری اور باہر نکلتے نکلتے باورچی خانے کی طرف دیکھا

میری نگاہیں کالے کالے نینوں سے ٹکرائیں۔ اور وہ مسکرا کر باہر نکل گئی۔ میرے دل

پہ برق سی گری اور میں درد کو لبھائے باورچی خانے سے نکلا۔ یہ آغاز تھا۔

"ماں کون تھی یہ! ۔ دیکھو نا مجھے دیکھ کر کتنا لمبا گھونگھٹ نکال لیا۔ کیا میں اسے کھانے لگا تھا۔ ماں تمہیں دکھ نہیں ہوا اس بات سے؟"

"چل شریر کہیں کا۔ غیروں کی بہو بیٹیاں کیوں تیرے سامنے آنے لگیں"

"غیروں کی کیا مطلب؟ کیا یہ آدم اور حوا کی نسل سے نہیں تھی؟"

"تُو تو بے کار دماغ چاٹنے لگا ہے"

"ماں! ۔ بیبیاں، کسبیاں، پدمنی، سنکھنی، چترنی، کلنکنی، کرہگنی، کلجگنی، بیسوا ۔ پتی ورتا ۔ کامنی ۔ بامنی ۔ دیویاں ۔ رنڈیاں ۔ کنجریاں اور ستونتی سب ہی آدم کی نسل سے ہیں اور حوا کی لاڈلی بیٹیاں ہیں"۔ کامران کہہ رہا تھا اور دلہن جھکی جھکی نگاہوں کے ساتھ ہنس رہی تھی۔

"یا اللہ! توبہ میری۔ اس بچے نے تو میرے کان کھا لئے"

"ماں" میں نے بڑھ کر بوڑھی والدہ کے دونوں بازو تھام لئے۔ ان لوگوں کو خدا جانے انسانوں سے کیوں بیر ہے۔ بہت ہی بُرے ہوتے ہیں ایسے لوگ جو دوسروں کو دیکھ کر یوں لمبا گھونگھٹ نکال لیتے ہیں"

"ڈھیٹ کہیں کا ۔ ارے ہٹ بھی ۔ مجھے نماز پڑھنی ہے"

"جا اپنا کام کر! ۔ تمام دن آوارہ پھرتا رہتا ہے" والدہ اٹھیں اور لوٹا اٹھا کر نلکے کی طرف بڑھیں۔

"لاؤ ۔ میں بھر دوں لوٹا" میں نے ان کے ہاتھ سے لوٹا لے لیا اور پانی سے بھر کر رکھ دیا۔ وہ وضو کرنے کے لئے بیٹھ گئیں۔

"ماں کون تھی یہ --؟"

"تیرا کیا واسطہ ہے اس سے -تیری طرف سے کوئی بھی ہو- میں نے لاکھ بار کہہ دیا ہے کہ میں نہیں بتاؤں گی- کہ یہ ہمارے پچھواڑے رہتی ہے -فضول دماغ چاٹ رہا ہے میرا-"

"تمہاری مرضی -اگر بتا دیتیں تو اچھا تھا"

"ٹھہر تو- یوں نہیں مانے گا" ماں نے اپنے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا- میں ہنستا ہوا سیڑھیوں کی طرف دوڑا

آہا...... میں تو چندا سی گوری نار

اوہو..... میں تو چندا سی گوری نار

دیکھو جی کوئی نجر لگائیو نا -

دلہن ہنس پڑی اور کامران بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا

"یہ گراموفون نہیں تھا- بلکہ خوشی کے مارے میں جھوم رہا تھا- کھٹ کھٹ میں اوپر چڑھ گیا- اسی کمرہ کے اوپر- جس میں ہم بیٹھے ہوئے ہیں-" دلہن نے بیٹھے بیٹھے اپنی پلکیں اٹھائیں- اور کڑیوں کی طرف دیکھا

"اب لیٹ جاؤ! بہت دیر ہو گئی ہے-" کامران نے دلہن کے دونوں بازو پکڑ لئے اور اس کی خمار بھری آنکھوں میں نگاہیں گاڑ دیں-

"دیکھو دو بج رہے ہیں-" کامران نے سامنے دیوار پر ٹک ٹک کرتے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا -اور دلہن نے اپنی نظریں گھمائیں -

"میرا کہا مانو!- لیٹ جاؤ-" دلہن نے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں- کامران نے

تھوڑا سا کھسک کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اور پلنگ پر پڑی ہوئی شال اٹھا کر اس کے دونوں پاؤں پر ڈال دی۔ دلہن نے آرام سے پاؤں پھیلا دیئے۔ کامران نے ہاتھ بڑھا کر قریب ہی رکھی ہوئی میز پر اپنی مٹھی کھول دی۔ کانچ کے ٹکڑے میز پر بکھر گئے۔

"میں چھت پر چڑھ گیا اور اپنے مکان کے پچھواڑے کی طرف جھانکا پچھواڑے والے مکان کا صحن اور گلی کی طرف کھلنے والا دروازہ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ کھلا اور وہی دوشیزہ نقاب الٹ کر صحن میں داخل ہوئی۔ چند قدم چلنے کے بعد دوشیزہ کی نگاہیں اوپر اٹھ گئیں۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتی ہوئی دائیں ہاتھ کی طرف کمرے میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے ہاتھوں میں کچے چاولوں کی بڑی سی طشتری لئے ہوئے کمرے سے نکلی اور صحن میں چارپائی ڈال کر اس پر بیٹھ گئی۔ اس نے طشتری اپنی گود میں رکھ لی اور چاول چننے کے بہانے بار بار نظریں اٹھا کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس طرح تقریباً آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ میں اپنی اس اچانک کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ اور مسکرا مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ کہ نیچے سے حامد کی آواز آئی۔

"وہی حامد جس کا ابھی میں نے ذکر کیا تھا۔" کامران نے دلہن کی طرف دیکھا جو کہ بڑی دلچسپی کے ساتھ داستان سن رہی تھی۔

"یہ بھی اچھے وقت آکر مرا۔" میں نے حامد کی آواز کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اور بڑبڑاتے ہوئے سوچا۔ کہ آوازیں دے کر خود ہی چلا جائے گا۔ مگر وہ ذات شریف آسانی سے ٹلنے والے کب تھے۔ کھڑے ہو کر آوازوں پہ آوازیں دینے لگے۔

"کامران کے بچے۔ نیچے کیوں نہیں آجاتا۔ بچارہ حامد کب سے کھڑا آوازیں دے رہا ہے۔" اماں نے نیچے سے آواز دی اور میں حامد کو کوستا ہوا نیچے اترنے کے لئے اس انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ کہ وہ میری طرف دیکھے اور میں اسے دیکھ کر چلا جاؤں آخر اس نے میری جانب پلکیں اٹھائیں اور میں سلام کر کے نیچے اتر آیا

یہ پہلی جرأت تھی جس نے مجھے بے باک بنا کر زنجیرِ جرم کی پہلی کڑی تیار کی۔ دوسرے دن میں کتابیں لئے گھر میں داخل ہوا۔ وہ امی کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ میں سیدھا باورچی خانے میں گھس گیا۔ اور دروازہ کی آڑ لے کر اسے دیکھنے لگا۔ میری محبوبہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ جی چاہا کہ بڑھ کر اسے سینے سے لگالوں اور پیارا پیارا مکھڑا چوم لوں۔" دلہن کامران کی گود میں کسمسائی اور کامران نے شال کو درست کرتے ہوئے اپنا ہاتھ بھی شال کے نیچے چھپا لیا۔

"اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ برقعہ لے کر اٹھی۔ والدہ کو سلام کرتی ہوئی سر پہ برقعہ ڈال کر دروازہ کی طرف بڑھی۔

"نازلی"

"جی ماں جی" امی کی آواز پر وہ دانستہ دروازہ میں میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"میں نے کہا کل وہ کپڑا مجھے ضرور دکھلا دینا۔"

"جی۔ بہت اچھا۔" اماں کو جواب دے کر نازلی نے میری طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر نقاب ڈالتے ہوئے مجھے سلام کیا اور باہر نکل گئی۔

"نازلی کل بھی آئے گی۔" میں نے کھانا سامنے رکھ لیا۔ لیکن بھوک بالکل اڑ چکی تھی۔ مجبوراً دو چار لقمے زہر مار کئے اور پانی پی کر اوپر چڑھ گیا۔

سامنے صحن میں نازلی چارپائی پر لیٹی ہوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جھٹ سے بیٹھ گئی۔ اس کا یوں بیٹھ جانا بہت ہی ناگوار گذرا۔ اور میں دیوار پر اپنی کہنی ٹیک کر اسے دیکھنے لگا۔

"نازلی!۔ او نازلی کی بچی۔ کچھ کھانے پکانے کی بھی فکر ہے تجھے۔ یا تمام دن یہ موئے رسالے ہی پڑھتی رہیگی۔ کل سے میں انہیں چولہے میں جھونک دوں گی۔" پندرہ بیس منٹ کے بعد نازلی کی ماں چلائی اور نازلی زور سے چارپائی پر رسالہ پٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے میری جانب دیکھا اور مسکرا کر اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک طرف گھس گئی۔ میں انتظار کر کے نیچے اتر آیا

"نازلی تم!"۔ میں کتابیں لئے صحن میں داخل ہوا۔ اور نازلی کو اکیلے بیٹھے ہوئے دیکھ کر بولا۔ "ماں کہاں ہے؟" نازلی جواب دینے کی بجائے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے سمٹ گئی۔

"نازلی بتاؤ نا۔ ماں کہاں گئی ہے؟"

"نازلی!"

"ماں جی۔ وہ کسی جگہ کپڑے لے کر گئی ہیں"

"تب تو خالہ کے ہاں گئی ہوں گی۔" میں نے خوش ہو کر نازلی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

چھوٹا بھائی اور ہمشیرہ ابھی سکول سے نہیں آئے تھے۔ گھر میں صرف میں اور نازلی تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر جلدی سے باہر کے کواڑ جو کہ نیم وا تھے، بند کر دیئے

"نازلی۔" میں نے آ کر پھر نازلی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کواڑ کیوں بند کر آئے۔"

"کنڈی تھوڑا ہی لگائی ہے۔"

"ہٹو بھی کوئی دیکھ لے گا۔"

"ارے صاحب آج تو اپنے کاندھوں پہ بیٹھے ہوئے فرشتوں نے بھی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ قسمت سے تو موقع ملا ہے۔ اور تم ہو کہ دھتکار رہی ہو۔" میں زبردستی نازلی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر زانو پر رکھ لیا۔" دلہن نے کامران کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہچکولے کھاتے ہوئے سینے پر رکھ لیا

"ماں جی آجائیں گی۔"

"ابھی نہیں وہ تو کہیں گھنٹہ بھر کے بعد آئیں گی۔ میری خالہ بہت باتونی ہیں۔ باتوں میں لگا لیا ہو گا۔ ہاہاہا۔"

"کافی دیر ہو گئی ہے انہیں گئے ہوئے۔"

"کوئی پرواہ نہیں۔" میں نے اکڑ کر نازلی کا ہاتھ اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ اس پہ میری ہمت بڑھی اور میں نے بالکل اسی طرح۔" کامران نے دلہن کے سینے سے ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ دلہن نے پھر کامران کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سینے پر رکھ لیا۔" اسے گود میں لٹا لیا اور اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔" دلہن پھر کسمسائی۔

"نازلی کی بھی کچھ جھجک کھلی اور وہ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگی۔

"اب جائیں۔ ماں جی آتی ہی ہوں گی۔"

"ہوں، ہوں کیا کہہ دیا تم نے۔"

"سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ کچھ گھبرا سی گئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اچھا تو پھر کب ملو گی؟"

"ارے واہ، پھسل ہی گئے"

"اچھا! - تو جاؤ پھر میں بھی نہیں اٹھتا"

"خدا کے لئے" نازلی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ لئے

"تو پھر وعدہ کرو"

"اچھا تو رات کو چھت پر"

"چھت پر - تو میں کیا کروں؟"

"کیا کیا کرتے ہیں" نازلی نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور میں جھینپ گیا۔

"میرا مطلب ہے - تمہاری چھت تو نیچی ہے"

"نیچی ہے تو مرد ویسے ہی بنے پھرتے ہو - جالیوں میں پاؤں رکھتے ہوئے چلے آنا -

"او میری نازلی" میں نے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی - اور باورچی خانے میں گھس گیا

"ارے کامران! تو کب آیا؟"

"ابھی آیا ہوں - ماں" نوالہ حلق سے اتار کر میں نے کہا -

"وہاں کوئی بیٹھا ہے - اس لئے سیدھا ادھر ہی چلا آیا"

"اچھا اچھا تمام کھانا خراب نہ کر دینا - تیرا چھوٹا بھائی آنے والا ہے"

"چھوٹے بھائی کی ہر وقت فکر - یہاں کوئی پوچھتا ہی نہیں"

رات کی کالی دوشیزہ ستاروں جڑی چنری اوڑھ کر نکلی - سب لوگ سو گئے اور میں دبے پاؤں چھت پر چڑھ گیا - معمولی سردی پڑنے لگی تھی - لوگ چھتوں کو چھوڑ کر کمروں میں جا گھسے تھے - چپ چاپ سی فضا تھی - اور مکانوں پر حسرت برس رہی تھی - میں چھت پر کھڑے ہو کر نازلی کا انتظار کرنے لگا - تھوڑی دیر کے بعد نازلی آ گئی - میں اینٹوں

کی جالیوں کے سہارے نیچے پہنچ گیا۔ اور ہم دونوں ایک کونے میں بیٹھ کر، دنیا کے تفکرات سے دور۔ اپنے دلوں کی دھڑکنیں آپس میں مل کر گوندھنے لگے۔

"اچھا اب چلئے!"

"نازلی"

"دیکھئے اتنی بے تابی بھی اچھی نہیں"

"کیا کروں کلیجے میں ہر وقت آگ سی لگی رہتی ہے۔"

"برف کی ڈلی رکھ لیا کرو۔ سہل علاج ہے" وہ مسکرادی۔ میں نے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اور اپنے سلگتے ہوئے ہونٹ اس کے رخسار پر رکھ دیئے۔

"اوئی توبہ۔ اتنی بھی کیا بے صبری ہے" نازلی میری بانہوں میں سے نکل گئی۔

معصوم اور نوزائیدہ بچوں کی روحیں ماؤں کی گود سے جدا ہو کر آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی تعداد میں اضافہ کرنے لگیں۔ حوریں قصرِ فردوس سے جھانکیں فرشتوں نے ٹھنڈی آہیں بھریں۔ اور سکانِ خلا نے قہقہے لگائے۔ دن رات کی سفر تا کے ساتھ ساتھ ہم بھی بڑھے اور تقدیر نے بھی کئی پانسے پلٹے۔ کئی سال ہماری دھڑکنیں اپنے دلوں میں چھپائے ماضی کے دھندلکوں سے جا لگے۔ اور میں تعلیمی امور سے فراغت پا کر باہر جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ میرا دل نازلی کو پل بھر بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کی جدائی کا تصور میری روح کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔

قسمت کی بات دیکھئے میں نازلی کا دیوانہ بنتا جا رہا تھا۔ اور وہ کسی اور ادھیڑ بن میں مصروف تھی۔ گو وہ مجھ سے راتوں میں آ کر ملتی تھی۔ لیکن اس دل سے نہیں۔ کسی اور دل کے ساتھ۔ میں نے اسے دن بدن بدلتے ہی دیکھا۔ نازلی کی بے اعتنائی اور بڑھا پن میرے

دل کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ اور میں نے شکوہ وشکایات کا طومار باندھ دیا۔ اس نے میرے ساتھ جیون نبھانے کا عہد کیا تھا۔ اور میں نے اسے ہمیشہ اپنا حقیقی ساتھی اور غمگسار سمجھا تھا۔ پھر بھلا میں اس کی آوارگی اور اکثر اوقات غائب رہنے کو کیسے برداشت کر سکتا تھا" کامران کا ہاتھ دلہن کے سینے پر سے پھسل کر دھڑکتے ہوئے دل پر آ گیا۔

"جتنا میں اسے سمجھاتا۔ اتنا ہی وہ مجھ سے بگڑتی۔ گویا میرا کسی کو شرافت کی تلقین کرنا ہی میرے لئے غموں کا باعث بنا۔ میں ٹھنڈی راتوں میں، جب وہ آتی۔ اس کی تعظیم میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ سمجھتی ہو کہ کیوں؟" کامران نے دلہن کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور دلہن نے اپنے دل پر رکھا ہوا کامران کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"وہ میری محبوبہ تھی۔ اس کی تعظیم میری اپنی تعظیم تھی۔ لیکن عورت کے فطری رنگ نے اپنے نکھار کو نمایاں کر کے دھیرے دھیرے میرے دل سے اپنی عزت گرا دی۔ اور اس کی تعظیم و تکریم میری نگاہوں سے گر گئی۔ یہ سب کچھ ہی ہوا۔ لیکن پھر بھی وہ میری محبوبہ تھی۔ میری آگ، اس کے بغیر دھیمی نہ ہوئی اور میں وقت کی تپشوں کے ساتھ ساتھ سلگتا ہی رہا۔ میں اس سے اب بھی شادی کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ میرے پاس رہنے کے بعد وہ اپنے اطوار میں عمدگی پیدا کرے گی۔ اور میرا قرب اسے ظلمات کی پستیوں سے نکال کر حقیقی انبساط کی بلندیوں سے روشناس کرا دے گا۔

"لیکن نہیں پھول پہلے ہی کملا چکے تھے چمن میں آندھیوں کا دور دورہ تھا۔ وہ بغاوت پر تل چکی تھی۔ اس کے دل میں میری ہی پروردہ دھڑکنیں میرے خلاف علمِ سرکشی بلند کر چکی تھیں۔ وہ ایک رات پھر میرے پاس آئی۔ اور یہ اس کی آخری ملاقات تھی۔ اس کے آخری الفاظ کے ساتھ ساتھ آج مجھے اس کے وہ بول بھی یاد ہیں جو اس نے ایک دن میرے باہر جانے کی خبر سن کر مجھ

سے کہے تھے۔

"میرے ساتھی! بدل نہ جانا۔ دنیا کی رنگینیوں میں کہیں غرق ہو کر مجھ سے آنکھیں نہ پھیر لینا۔ میں وہی ہوں۔ یاد رکھنا! ۔ایک سچی بیوی تمہاری محبت کا سہارا لئے تمہاری راہ میں پلکیں بچھائے، آس لگائے بیٹھی رہیگی۔ بھولنا نہیں۔"

"ان الفاظ اور ان بولوں کو پرکھو! ۔جانچو! ۔اور اندازہ لگاؤ۔ میرا جرم کیا تھا؟ اور سزا کیا ہے؟" کامران نے دلہن کی جانب گھائل کر دینے والی نگاہوں سے دیکھا اور پھر ماضی کے دل سے بنے ہوئے پارچۂ الفت کے اکھڑے ہوئے دھاگوں کو ناخنِ وفا سے سنوارنے لگا۔

"گو میں نے عہد کر لیا تھا کہ میں نازلی سے کچھ نہ کہونگا۔ گلہ نہیں کروں گا۔ شکوہ نہیں کروں گا۔ لیکن یہ دل نہ مانا اور میں غلطی کر ہی بیٹھا۔"

"تم نے اپنے آپ کو سمجھ کیا رکھا ہے؟ میں تمہارے پاس چلی آئی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اوباش ہوں۔ آوارہ ہوں۔ میں سب جانتی ہوں کہ ہم دونوں میں سے ہیرا کون ہے اور پتھر کون۔ تم۔ تم! کنجریوں کے در پہ پڑے رہنے والے انسان میری وفا کو کیا جانو۔ تم خود پاپی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے بھی پاپن تصور کرتے ہو۔ جاؤ! وہیں جاؤ!! جہاں انسان کی عزت کو چار چاند لگتے ہیں۔ اور وفا سستے داموں تقسیم ہوتی ہے وہاں تمہیں رتبہ ملے گا۔ شان و شوکت ملے گی۔ جاؤ۔ مجھے تمہاری حاجت نہیں۔ جلدی کرو۔ ببو اپنی جھولی میں وفا بھرے تمہارا گلابے چینی سے راہ دیکھ رہی ہے۔" نازلی نے اونچی نیچی آوازوں میں نہ جانے کیا کیا کہہ دیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اور میں اس کے اونچا اونچا بولنے کی وجہ سے اور رسوائی

کے ڈر سے گھبرا گیا۔ غیر کے مکان پر میں موجود تھا۔ ہر باعزت انسان اکثر ڈرا ہی کرتا ہے ماں کے وہ الفاظ "غیروں کی بہو بیٹیاں" مجھے اس وقت یاد آئے۔ جب تیر کمان سے نکل کر کہیں کا کہیں پہنچ چکا تھا۔"

"نازلی! نازلی!!"۔ میں نے بڑھ کر نازلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ تم کون ہوتے ہو میری کلائی تھامنے والے؟۔ تمہارے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ آئندہ اور کوئی احسان کرنے کی تکلیف گوارا نہ کرنا۔" نازلی نے جھٹکا مار کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اور دھپ دھپ کرتی نیچے اتر گئی۔ نازلی جا چکی تھی۔ چند چوڑیوں کے ٹکڑے میرے ہاتھ میں چھوڑ کر اور چند چھت پر گرا کر۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے چھت پر پڑے ہوئے چوڑیوں کے ٹکڑے سمیٹ کر اپنی جیب میں ڈال لئے اور ماتم تقدیر کرتا ہوا واپس لوٹ آیا

اس کے بعد بھی میں نے چھت پر چڑھ کر اپنے دل کو بہلانے کی کوشش کی۔ مگر جانے والے کب لوٹ سکتے ہیں۔ وہ میری محبوبہ۔ دل کی رانی جس کی پوجا میں نے ہمیشہ ایک دیوی سمجھ کر سچے دل سے کی۔ اپنے پجاری کو ایک نظر بھی دیکھنے نہ آئی۔

۔مجھے بہت صدمہ ہوا اور میں نے اسے نہ دیکھنے کی قسم کھائی۔ آج پورے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ وہ بھی اپنی ڈگر پر قائم ہے اور میں بھی اپنے عہد پر۔

میں نے کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی۔ ہاں کبھی کبھی ہنسنے کی آواز صرف سنائی دے جاتی ہے۔ میرا دل ٹوٹ گیا اور میں نے سب خوشیوں کو خیر باد کہہ دیا۔ جب کبھی اس کی یاد زیادہ ہی تڑپانے لگ جاتی تھی۔ اور میرا دل بھر بھر آتا۔ تو میں یہ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں سامنے رکھ کر سسکتے آنسوؤں سے ماضی کی مٹی میں دبی ہوئی یادوں کو سمیٹتا تھا۔۔۔ اور

لیپ رہا ہوں" کامران کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر دلہن کے سینے پر رکھے ہوئے ہاتھوں پر گرے اور دیوار پر ایک موٹی سی چھپکلی شکار کی طرف تیزی سے لپکی۔

" اس کے بعد مجھے ہر عورت سے خوف آنے لگا۔ میرے دوست کو بھی ایک ڈینیلی ڈس کر کہیں جا کھوئی تھی۔ اب میں ہر ناری سے ڈرتا ہوں" کامران نے دلہن کی طرف دیکھ کر اس سے سوال کیا

" آخر یہ حوا کی بیٹیاں چاہتی کیا ہیں؟ یہ اتنی بے وفا کیوں ہوتی ہیں۔ اور کہیں تم تو اپنی ریت کو نہ نبھاؤ گی"

" تا اچھا اچھا کی کرنے والی عورتیں بے وفا بھی ہوتی ہیں اور آوارہ بھی رہا میرا سوال"

دلہن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی اور کامران کی گود میں پڑے پڑے ہی اس نے کروٹ لی۔

" تم بھی رونے لگیں۔ میں بھی کتنا بد قسمت انسان ہوں۔ کہ پہلی ہی ملاقات میں تمہارے ننھے سے دل کو ٹھیس پہنچا دی" دلہن نے چت لیٹ کر کامران کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

کامران چپ ہو گیا۔ اور چند سیکنڈ کے بعد پھر بولا۔

" یہ میرا جرم ہے۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ اب تمہیں کلی اختیار ہے۔ چاہے جو سزا دو"

" میں تو کنیز ہوں" دلہن کے عرصے سے بند پتلے پتلے ہونٹ کھلے۔

" یوں مجھے سر نہ چڑھاؤ۔ سر چڑھی چیز ہمیشہ تکلیف دیتی ہے"

" نہیں مالک" دلہن نے اپنے دونوں ہاتھ کامران کی گردن میں حمائل کر دیئے

" ایسا نہیں۔ خاوند عورت کے سر کا تاج ہوتا ہے۔ اور انسان ہر اس چیز کو سر چڑھاتا ہے جو انمول ہے۔ آپ میرے سر تاج ہیں اور خدا کرے ہمیشہ ہی سر کے تاج رہیں۔ تاکہ میں اپنی زندگی

کے عارضی لمحے آپ کے سایہ تلے گزار دوں، وہ ایک انوکھا سکھ محسوس کر سکوں۔" دلہن نے اپنے ہاتھ پھر سینے پر رکھ دئے۔

"میری تقدیر! - تم میری زندگی ہو - میں اپنا جیون تمہاری خوشیوں کے فراہم کرنے میں تیاگ دوں گا۔" کامران اپنی دلہن کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ آج سے میں تمہیں بھی نیلی کہا کروں گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نام بے وفائی کا سرچشمہ ہے۔ اور ہر نیلی ہل کر دغا دینے والی ہوتی ہے۔ لیکن کوئی پرواہ نہیں۔ میں اپنی قسمت کو اسی نام کی اوٹ میں مسکراتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور اپنے جیون ساتھی کو اسی نام کے سائے میں پھلتے پھولتے دیکھنے کا متمنی ہوں۔ اب تم میری نیلی ہو - میری نیلی '۔ نیلی"۔ کامران نے دلہن کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر ایک مختصر سے لمحے کے بعد اس نے اپنے ہونٹ دلہن کے لبوں سے پیوستہ کر دیئے۔

" اب تم تھک گئی ہوگی - آرام کرو! - ساڑھے تین بج رہے ہیں - میں نے تمام رات ہی گنوا دی۔"

" نہیں جیون سہارے ۔" دلہن نے کامران کی گود میں پڑے پڑے پھر کروٹ لی اور اپنا ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ٹوٹی چوڑیاں اٹھا لیں - ہنس کر کامران کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے ایک جھٹکے کے ساتھ مٹھی کھڑکی کی طرف کھول دی - چھن چھن کرتے ہوئے کچھ ٹکڑے کھڑکی سے اچھل کر گلی کی تاریکی میں گم ہو گئے - اور کچھ ٹکڑے چوکھٹ سے ٹکرا کر وہیں گر پڑے - دیوار سے چمٹی ہوئی چھپکلی ایک طرف بھاگی - اور کامران نے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں ۔

ہم جیتے نہ تم ہارے

"ایک عرصہ ہوگیا ہے۔" شاعر نے ٹھنڈی آہ بھری

"کیا ہوا؟ ۔کوشش بڑی چیز ہے ۔تمہاری محبت میں اگر جان ہے ۔تو تم ضرور کامیاب ہوگے"۔ کوچنگ نے آس دلائی ۔

"محبوس پنچھی کی مانند ہوں ۔دل تڑپا جا رہا ہے ۔ دماغ بھی سوچنے سے قاصر ہے ۔کروں تو کیا کروں ۔"

"ہمت سے کام لو ۔ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہے ۔" سفید فنجان میں پڑی ہوئی شنگ فی چائے کا آخری گھونٹ بھر کر کوچنگ کھڑا ہوگیا ۔

"شاعر اب چلتے ہیں ۔تمہاری بھابھی انتظار کر رہی ہوگی ۔"

"اچھا دوست ۔گلشن زلیست کے پرشباب غنچوں کی رنگین بہاریں لوٹو ۔ کھیلو، کودو!! اور موج مناؤ ۔ ہاں ۔ چھوٹے نصیب والوں کو بھی کبھی کبھی سہانی گھڑیاں

میں یاد کر لیا کرو !!"

"میرے دوست! خوش بخت انسان ہو۔ ایک وقت وہ آئے گا۔ تم خود اپنی قسمت پر رشک کرو گے۔"

"رشک۔"

"دیکھ لینا۔"

"اس جنم میں تو نہیں۔ البتہ کسی اور۔۔۔"

"بعض وقت تو عجیب باتیں کرنے لگتے ہو۔ تم بھی۔"

"عجیب جو ٹھہرا۔"

کوچنگ چلا گیا اور شاعر بحرِ خیالات میں غوطے کھانے لگا۔

"میں آج اس کے کانوں تک ضرور اپنے دل کی آواز پہنچاؤں گا۔ اور کوچنگ کو بتلا دوں گا۔ کہ میں بزدل نہیں۔ شاعر بزدل نہیں۔ میرے گیتوں میں جادو ہے۔ بولوں میں سحر ہے۔ میری کویتا بذاتِ خود ایک طلسم ہے۔ وہ طلسم کہ سامری بھی اس کے چکر سے نہیں نکل سکتا۔ میں اس کے کانوں میں افسوں پھونک دوں گا۔ اپنی سحر بیانی سے اسے مسحور کر کے چھوڑوں گا۔"

شاعر جوش میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر کرسی پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ اس نے قلم اٹھایا ـــــ اور لکھا۔

"سپنوں کی رانی!" اوں ہوں۔ شاعر نے کاغذ پھاڑ دیا۔

"میری ناہید!" یہ بھی نہیں

"میری دیوی!!"

"میری ملکہ!"

"میری زندگی کے چمن کی بہار۔" اوں ہوں۔ باری باری لکھ کر شاعر پھاڑتا گیا اور پھر قلم ہاتھ میں لے کر سوچنے لگا۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔" اس نے سر ہلایا۔ اور دھڑکتی ہوئی نبضوں کے ساتھ لکھا "میرے گیتوں کی جان!۔ آؤ۔ ایک شاعر کے بول تم بن ادھورے ہیں — آجاؤ!! اور شاعر کا کلیجہ اپنی ناگن زلفوں سے ڈس لو۔ دو گھڑی کے لئے۔ چاہے پھر چلی جانا۔" شاعر نے کاغذ کے پرزے کو احتیاط سے تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا اور باہر نکل گیا۔ اس کے بال دو چاہنے والوں کی مہجور راتوں کی طرح پریشان تھے اور چہرہ ایک زندگی سے تھکے ہوئے شخص کی روح کی مانند بے رنگ۔ وہ کامیاب شاعر تھا مگر ناکام عاشق۔

"یہ شخص روزانہ یہاں بیٹھا رہتا ہے۔ دیکھو تو! کتنا ڈھیٹ ہے۔ دید سے تک بھی نیچے نہیں کرتا۔" تلسی نے اپنی سہیلی تانیا سے کہا۔

میں اسے تقریباً ایک سال سے اسی طرح دیکھ رہی ہوں۔ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ کتنا سادہ ہے۔ کوئی شریف انسان دکھائی دیتا ہے۔"

"تانیا نے شاعر پر اچٹتی نگاہ ڈالی

"کوئی چور اچکا ہوگا۔"

"کیوں کسی پر تہمت لگاتی ہو۔"

"تمہیں نہیں معلوم یہ مردوے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ دیکھنے میں کچھ اور حقیقت میں کچھ۔ کوئی دیوانہ ہے۔ دیکھو تو بال کس طرح مٹی میں اٹے ہیں۔ تلسی نے منہ

بنایا۔

" دیوانہ نہیں۔ مصیبت زدہ دکھائی دیتا ہے۔"

" بس رہنے دو۔ مصیبت کا مارا ہوتا تو یہاں کیوں دھکے کھاتا۔ کہو تو ماروں تھپڑ بھگا دوں مصیبت۔ تاکہ اسے بھی پتہ چلے کہ شریف زادیاں ایسی ہوتی ہیں۔"

" نہ بہن۔ ایسا نہ کر بیٹھنا۔ خبر نہیں۔ کس افتاد کا مارا ہے۔ بیٹھا رہنے دو ہمیں کیا۔"

" تمہاری مرضی۔ ورنہ ایسا مزہ چکھاتی۔ کہ یہ بھی کیا یاد رکھتا۔"

" بس بس زیادہ غصہ ٹھیک نہیں۔" تانیا مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔ آؤ چلیں۔"

" واقعی میں بزدل ہوں۔ حد درجہ بزدل۔ کوچینگ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ لیکن ۔۔۔ میرا کیا دوش۔ وہ اکیلی تھوڑا ہی تھی۔ اگر اس وقت میں ہمت کر لیتا۔ اور جوں توں کر کے اس کے کانوں تک اپنی بے زبان دھڑکنوں کی آواز پہنچاتا۔ تو اس کے سننے سے پہلے اس کی سہیلی سن لیتی۔ اسے خفت اٹھانی پڑتی۔ اور میرے لئے مفت میں بدنام ہو جاتی۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں اسے بدنام نہ ہونے دوں گا ۔۔۔ میں بدقسمت ہوں۔ میری بدبختی راہ میں روڑے اٹکاتی ہے۔ کسی کو کیوں دوش دوں۔ میں ہی اس قابل نہیں کہ کسی کو پیار کروں۔ چاہوں۔ میرے لئے تو موت ہی پیاری ہے۔" شاعر من ہی من میں اپنے آپ کو کوسنے لگا

" کہو شاعر کیسی گزر رہی ہے۔"

" اچھی ہی سمجھ لو۔ اپنی سناؤ۔"

" مزے ہی مزے لکھ دئیے ہیں۔ اپنی قسمت میں تو۔" کوچینگ ہنس پڑا۔

"چلو کسی کی تو سکھ میں بسر ہو رہی ہے۔" شاعر چپ ہو گیا۔ اور میز پر آہستہ آہستہ چٹکی مارنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔"

"ارے تم تو رونے لگے۔" سسکتے ہوئے آنسوؤں کو کوچنگ نے شاعر کی پلکوں میں لرزتے ہوئے دیکھا۔

"نہیں تو۔" شاعر نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

"مت چھپاؤ دوست۔ ! تمہاری نمناک آنکھیں۔ اترا اترا چہرہ دیکھ کر ہر کوئی بتلا سکتا ہے۔ کہ تمہیں اندر ہی اندر کسی کی یاد کھائے جا رہی ہے۔"

شاعر خاموش تھا۔ اس نے پلکیں اٹھا کر کوچنگ کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

"ہمت کرو۔ مردوں کا سا عزم اپنے دل میں پیدا کرو۔ پھر دیکھنا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ میرا کہا مانو ! ورنہ پھر تمہیں کہنا پڑے گا کہ تم بزدل ہو۔"

"کچھ بھی کہہ لو۔ میرا جی بھر کر مذاق اڑا لو ! ۔ کہ خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو۔ آج میری طبیعت بے حد پریشان ہے۔"

"تمہاری مرضی" کوچنگ کاندھے سکیڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"پھر تو چلے۔ تمہاری بھابھی نہ جانے کب سے بیٹھی راہ دیکھ رہی ہوگی۔"

موسم رنگین تھا۔ شاعر ہری ہری دوب پر آ کر بیٹھ گیا۔ ہوا چلی۔ درختوں کی ٹہنیاں جھومنے لگیں۔ ایک جھونکے نے اس کے الجھے ہوئے بالوں کو سلجھانے کی سعی

کی ۔ مگر وہ اسی طرح الجھے رہے ۔ جیسے شاعر کی دگرگوں حالت ۔ وہ خاموش تھا۔ اس کو کسی کا انتظار تھا ۔ اس کی نیم وا آنکھیں گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں اور نگاہیں جا جا کر پلٹ آتی تھیں ۔ انتظار کی گھڑیاں بھی کتنی سہانی ہوتی ہیں ۔ دبلی پتلی سانولی سلونی تانیا ایک وقار کے ساتھ آئی ۔ اور اس سے کچھ دور پرے لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گئی ۔

قسمت سے آج وہ اکیلی تھی ۔ شاعر کے چہرے پر رونق آگئی ۔ جیسے پانی کے چہرے پر پڑے ہوئے مٹی کے ذرات آہستہ آہستہ تہہ میں بیٹھ گئے ہوں ۔ وہ ہمت کرکے اٹھا ۔ اس نے تانیا کے پاس کئی چکر لگائے ۔ مگر حوصلہ نہ ہوا ۔ کاغذ کا پرزہ جیب سے نکال کر اس نے مٹھی میں لے لیا ۔ تانیا اس کی بے چینی کو دیکھ رہی تھی ۔

" آپ کو کوئی تکلیف ہے ؟"

" جی ۔ ہاں ۔ نہیں " شاعر کے قدم تانیا کے بولنے پر وہیں جم گئے ۔

" یہ کیا پاگل پن ۔ کبھی ہاں ۔ کبھی نہیں "

" محترمہ ! "

" شاعر کی زبان جیسے کسی نے کاٹ لی ۔ وہ چپ چپ گھاس کی پتیوں کو پاؤں سے چھیڑنے لگا ۔ اس نے کاغذ کو اپنی مٹھی میں محسوس کیا ۔ اور پھر جی قابو میں کرکے کاغذ کا ٹکڑا اس کے سامنے رکھ دیا ۔

" ہوں تو یہ بات ہے ۔" تانیا شاعر کی تحریر پڑھ کر بولی

" تکسی ٹھیک کہتی تھی ۔ واقعی تم سڑی ہو ۔ چور ہو ۔ اچکے ہو ۔ شرم نہیں آتی "
وہ غصہ میں بھر گئی ۔

" بانو! میں چور نہیں ۔"

" جی ہاں یہ تو تمہارے ماتھے پر لکھا ہے۔"

" معافی چاہتا ہوں ۔گستاخی ہو گئی ۔" شاعر کی آنکھیں نمناک ہو گئیں ۔

" معاف کر دینا! ۔ میں مجبور تھا ۔ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہ ہو گی ۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر گھاس پر گر پڑے ۔ گھاس کی تیز پتیاں آنسوؤں کو چھید کر پار نکل گئیں ۔ وہ جانے کے لئے مڑا ۔

" چاہتے کیا ہو؟" تانیا متاثر ہو کر بولی

" پوجا ۔"

" پوجا ؟"

" ہاں "

" مطلب ؟"

" میں آپ کی پوجا کرنا چاہتا ہوں ۔ دور رہ کر ۔ ایک پجاری کی طرح ۔ میں یہ نہیں چاہتا ۔ کہ آپ بھی مجھ پر التفات کی نظر ڈالیں ۔ میری تو خواہش یہ ہے ۔ آپ مجھے صرف اتنی اجازت دے دیں ۔ کہ میں آپ کو دیکھ دیکھ کر جی سکوں ۔ سکون کے موتی رول سکوں ۔" شاعر کی آواز میں درد تھا ۔

" محترمہ ! ۔ جب راتوں کو خلوت کی گودیوں میں تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں ۔ اس وقت میرے سینے میں انگارے ہوتے ہیں ۔ انگارے ۔۔۔ دہکتے ہوئے ۔گرتے ہوئے تاروں کو ایک دنیا دیکھتی ہے ۔ لیکن ڈھلکے ہوئے آنسوؤں کو کوئی بھی نہیں دیکھ پاتا ۔ شاعر کی آنکھوں سے رم جھم ہوتی رہی اور تانیا کھڑی رہی ۔

"کہو شاعر"

"جی رہا ہوں"

"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں"

"اور کیا دیکھنا چاہتے ہو؟" شاعر مسکرا دیا۔

"تمہیں ہنستے ہوئے" کوچنگ بھی ہنس پڑا

"شاعر کیا بات ہے؟"

"بڑی مدت کے بعد آج نظرِ کرم کہیں جا کر پڑی ہے"

"مبارک! مبارک!! حال پوچھنے آئے تھے سو پوچھ چلے"

"کیوں نہیں ہماری بھابھی کب سے بیٹھی راہ دیکھ رہی ہوگی"

"شکر ہے — آج چہرہ پر کچھ تو رونق آئی" کوچنگ چلا گیا۔

شاعر اور تانیا ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ وہ مسرور تھا۔ اور شاعر بیٹھے بیٹھے نغمے سنائے جا رہا تھا۔ سپنوں کی رانی اس کا ہاتھ تھامے ہوئی تھی۔ اور وہ جھوم رہا تھا۔

"تمہارے ان ہونٹوں کی سرخی — میری تانیا! — سورج چرا کر احمری یاقوت کو عطا کرتا ہے" شاعر تانیا سے کہنے لگا۔

"ان شگفتہ گالوں کی لالی — اے ساحرہ! گلِ لالہ میں سمو گئی ہے۔ اس چہرے کا نکھار۔ اے روپ کی رانی۔ چنبیلی کے پھولوں میں آن بسا ہے۔ تمہارے چہرے سے چمٹے ہوئے یہ بھورے بھورے تل، اصل میں میرے دل پہ پڑے ہوئے انمٹ داغ ہیں۔ جو تم نے بخشے ہیں۔ اپنے پجاری کو سونپے ہیں۔ ان میں میری مجروح جان

اٹکی ہوئی ہے ۔۔۔ ہا ۔ کتنا سکون ہے یہاں ۔ ان پلکوں کی چھاؤں میں"

"بس رہنے دو! ۔ اتنی تعریف بھی اچھی نہیں ۔" تانیا نے نگاہیں جھکالیں

"کہیں یہ شاعری مجھے مغرور ہی نہ بنا دے"

"یہ دل صدمے اٹھانے کے لئے دھڑک رہا ہے ۔۔ تانیا! ۔ اے صبح کی دیوی! تم حسین صبح کی مانند ہو ۔ میرے خیالوں سے کہیں بلند ۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں صحرا میں بھٹک رہا ہوں ۔ سورج نے دم توڑ دیا ہے ۔ اور آسمان پہ سرمئی رنگ چاروں طرف بکھرا ہوا ہے ۔ میں ہار چکا ہوں ۔ اور تم ایک ٹیلہ پر کھڑی، ان حنائی ہاتھوں سے مجھے بلا رہی ہو ۔ اپنے دیوانے کو دعوتِ حسن دے رہی ہو ۔ تانیا! ۔ میری تانیا!!۔۔" شاعر نے تانیا کو دھیرے سے پکارا

"ہاں شاعر ۔ میرے شاعر!!" تانیا نے شاعر کے الجھے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں کے پورے گھسا دئے اور شانہ کرنے لگی ۔

"ان بہار آفریں پھولوں کی باہوں میں، سوئی ہوئی نکہت کی قسم! ۔ جب کبھی خوشبودار شاموں میں، سنہرے شفق کی طرف دیکھتا ہوں ۔ تو ایسا دکھائی دیتا ہے ۔ کہ تم سنہرے پانی میں غسل کرکے، دور تک پھیلی ہوئی ریت پر آکھڑی ہوئی ہو ۔ اور اپنی لانبی لانبی زلفوں کو شانوں پر بکھیر دیا ہو ۔ ایک تارا تمہیں دیکھنے کے لئے گگن کے پیچھے سے جھانکتا ہو ۔ اور مجھے نیند آنے لگتی ہے ۔ میں بے ہوش سا ہو جاتا ہوں ۔"

"تانیا ۔" شاعر نے تانیا کی طرف دیکھا ۔

"میرے بول تو ادھورے نہیں رہ جائیں گے ۔ کہیں مجھے چھوڑ کر چلی تو نہ جاؤگی ؟"
شاعر خود بخود اداس ہو گیا ۔

"نہیں شاعر۔ میرے شاعر" تانیا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"اگر تم نے ساتھ چھوڑ دیا۔ تو یاد رکھنا۔ یہ دل جو تمہاری محبت سے لبریز ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ پاش پاش ہو جائے گا۔ اور کوئی "تانیا" اسے جوڑ نہ سکیگی۔"

"مجھ پر بھروسا رکھو شاعر"

"کہو بھی شاعر۔ سنا ہے آج کل بڑے مزے ہو رہے ہیں۔" کوچنگ آتے ہی بولا

"دعا ہے بن باسیوں کی۔ جو اکثر پکارا کرتے ہیں" اگر عشق نہ ہوتا تو یہ دل کس کام آتا۔"

"اور بن کا بن جھوم اٹھتا ہے۔ اگر دل نہ ہوتا تو عشق کہاں گھر بناتا۔ کوچنگ فوراً ہی بول اٹھا اور دونوں دوست ہنسنے لگے۔

"لو بھئی شاعر۔ اب اجازت دو!"

"ابھی سے"

"بہت دیر ہو چکی ہے، گھر سے نکلے ہوئے۔ تمہاری بھابھی راہ دیکھ رہی ہوگی۔"
کوچنگ اٹھ کر چلا گیا اور شاعر محبوب کی یاد میں محو ہو گیا۔

"شاعر خوش تو ہو" دوسرے دن کوچنگ نے دور سے ہی ہانک لگائی۔

"احسان ہے اس کا۔"

"اوہو۔ آج تو ہمارے شاعر کی آواز بھی نہیں نکلتی۔ خیریت؟"

"خیریت ہی تو نہیں۔"

"کیوں؟۔ کیا آج سونٹھ کی پڑیا نہیں ملی۔"

"ہاں یار۔ آج تو اس کی جھلک بھی نہیں دیکھی۔ بیٹھ کر چلا آیا ہوں۔"

"چلو ایک دن جدائی کا لطف بھی اٹھالو!"

"مجبوری کا نام صبر ہے۔" شاعر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"گھبراؤ نہیں۔ جیت آخر میں ہنسنے والی کی ہے۔"

"دیکھئے! قسمت کیا گل کھلاتی ہے۔"

"پرواہ نہ کرو۔ شاعر کا نام بالا ہوگا۔"

"اچھا میں تو چلتا ہوں۔ وہی تمہاری بھابھی والا مسئلہ"

کوچنگ چل بھی دیا۔ شاعر اسی طرح اداس تھا۔ ٹمیالے رنگ کے بادل سروں پہ منڈلانے لگے۔ دودھیا بگلوں کی سفید سفید ڈاریں اٹھیں اور آسمان پر چکر کھانے لگیں

"آج کے دن گھر میں بیٹھنا تو اپنی ہستی پر ظلم کرنا ہے۔ شاعر!"

"کیوں آج کیا ہے؟"

"آج موسم جوان ہے۔ ہر چیز نکھری ہوئی ہے۔"

"ہر چیز کا تعلق روح کے ساتھ ہے۔ اگر روح خوش ہے۔ تو دنیا ہی خوشی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور اگر روح پژمردہ ہے۔ تو کائنات بھی......"

"جی ہاں۔ شاعر جو ٹھہرے۔ ان لوگوں کے دماغ بھی کچھ عجیب سے ہوتے ہیں۔ جب دیکھو کھوئے کھوئے سے۔ الوؤں کی طرح کھنڈرات ڈھونڈتے ہیں۔ یا تاریکی۔ تمہیں میرے ساتھ ضرور چلنا ہوگا۔ چلو! اٹھو" کوچنگ نے شاعر کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔

سیدھی سڑک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کوچنگ اور شاعر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"اب سناؤ۔ کیا حال ہے تمہارا؟"

"وہی ۔" شاعر نے مختصراً جواب دیا

"اس دن کے بعد پھر وہ نظر نہیں آئی کیا؟"

"نظر تو آئی۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولی ۔"

"ناراض ہو گی؟"

"شاید ۔"

"منا لیتے ۔ ذرا سی تو بات تھی ۔"

"اب تو اسے کوئی اور ہی منائے گا ۔"

"شاعر؟ ــــ"

"جھوٹ نہیں کہہ رہا ۔ وہ کسی اور کے ساتھ پھرتی ہے ۔"

"پھرتی ہے ۔ تو لعنت بھیجو ۔ کل موہی پہ ۔ نہ شکل نہ صورت ۔"

"کوچھنگ " شاعر چیخا ۔

"کیوں؟ دکھ ہوا ۔ سچی بات ہے ۔"

"ایسا نہ کہو۔ اس کی نہیں یہ میری ہتک ہے ۔ وہ دنیا کی نگاہوں میں کالی ہے ۔ تمہاری نظروں میں بدصورت ہے ۔ لیکن میرے لئے وہ کوہساروں کی فلک رس چوٹیوں پر اڑنے والی پریوں سے زیادہ خوش رنگ ہے ۔ وہ میرے خوابوں کی ملکہ ہے ـــ دل کا یہ بربط اس کے حسن کے تاروں کے بغیر بے آواز ہے ۔ ایسا نہ کہنا ـــ وہ میری آواز ہے ۔ دل کی آواز ۔ میں جینے کے لئے اسے ضرور اپناؤں گا ۔"

"کس قماش کے انسان ہو ـــ سب کچھ معلوم ہونے پر اسی کا دم بھر رہے ہو ۔"

"یہی تو زندگی ہے ۔ انسان راہ سے بھٹک ہی جاتا ہے ۔ میں نے اگر غلطی کی ہے ۔ تو ایک دن وہ بھی پشیمان ہو گی ۔"

"عجیب خیالات ہیں۔"

"دنیا ہے ۔ یہاں ہر قسم کا انسان بغیر ڈھونڈے مل جاتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے ۔ لیکن اگر میں تمہاری جگہ ہوتا ۔ تو ایسی عورت کی زندگی بھر شکل نہ دیکھتا۔"

"اپنی اپنی سمجھ ہے۔"

شاعر اور کوچینگ باتیں کرتے ہوئے کافی دور نکل گئے ۔ سڑک پر بیٹھے ہوئے بندر انہیں دیکھ کر درختوں پر چڑھ گئے ۔

"تانیا!" ایک دن شاعر کو تانیا مل گئی ۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا ۔

"تانیا بولو تو سہی ۔"

"کیوں میرے پیچھے پڑے ہو؟" تانیا تنک کر بولی

"میں تو تھکا ہارا مسافر ہوں جس کی منزل ابھی بہت دور ہے ۔ تانیا! چند گام چلنے پر ہی میری کمر ہمت نہ توڑو ۔ میں تو فقط تمہاری نظرِ کرم کے سہارے چل رہا ہوں ۔ مجھ سے یہ سہارا نہ چھینو!۔۔۔"

"بند کرو اپنی بکواس۔"

"تانیا ۔۔"

"تانیا تمہاری نہیں ۔ اب تو جو کی ہے ۔"

"تانیا کسی کی بھی ہو ۔ مجھے اس سے شکوہ نہیں ۔ میں تو تھوڑی دیر تمہارے پیارے گیسوؤں کے میٹھے سایے تلے سستانا چاہتا ہوں ۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر جینا چاہتا ہوں۔"

"بڑے ہی بے شرم ہو"

"اتنی سنگدل نہ بنو"

"بہت ہو چکی۔ اب اپنی راہ پکڑو"

"میری محبت کا صلہ یوں نہ دو"

"اوہو۔ تم اور محبت۔ یہ بھی خوب ہی رہی۔ ذرا اپنا حلیہ دیکھنا گھر جا کر"

"تانیا" شاعر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میرے پاس بے ہودہ باتوں کے لئے وقت نہیں" تانیا چلی گئی۔ شاعر دیکھتا رہا۔

"اچھا تانیا سدا خوش رہو۔ مجھ نصیبوں جلے کے حق میں ٹھیک فیصلہ کیا ہے" شاعر واپس چلا آیا۔

"شاعر اپنی ضد چھوڑ دو۔ دیکھو کئی دن ہو گئے ہیں۔ تم نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ بھلا ایسی باتوں سے کوئی فائدہ؟" کوچنگ شاعر سے کہنے لگا۔

"کیا کروں بھوک ہی نہیں لگتی"۔ شاعر کھانسنے لگا۔

"تم نے اپنے آپ کو تو تباہ کر لیا ہے۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟"

"موت۔ کوچنگ موت!!"

"کیسی باتیں کرنے لگے ہو"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ اس بدبختی کا علاج موت ہے"

"شاعر سچ پوچھو تو بعض دفعہ تم بہت ہی ستانے لگتے ہو"

"جب ناکام عاشقوں کی بد نصیب روحیں زندگی بھر سوگوار رہنے کے بعد بھی ویرانوں میں پریشان حال بھٹکا کرتی ہیں۔ تو دنیا والے ان راہوں سے گزرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔

بھلے آدمیوں سے کوئی پوچھے۔ جو پہلے ہی ستائے ہوئے ہوں۔ وہ کسی کو کیا ستا سکتے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو شاعر؟"

"جھوٹ تو نہیں کہہ رہا۔"

"اپنا نہیں تو دوسروں کا ہی خیال کرو!"

"میں کسی کو کیا کہہ رہا ہوں۔"

"اس سے زیادہ اور کیا کہو گے ۔ شاعر تمہیں تانیا کی قسم!۔"

"کوچنگ؟۔"

"کوچنگ نے چاولوں کی پلیٹ سامنے کر دی۔ شاعر نے بمشکل دو ایک لقمے لئے۔ اور پلیٹ ہٹا دی۔

"شاعر۔"

"بس بھئی۔"

تانیا کے منہ پھیر لینے سے شاعر کی دگرگوں حالت اور بھی ابتر ہو گئی ۔ وہ دن بدن گرتا ہی گیا۔ کوچنگ اپنے وقت کا زیادہ حصہ شاعر کی تیمارداری میں گزارنے لگا۔ وقت کا چکر چل رہا تھا اور شاعر کی جیون پھلواری میں پت جھڑ نمودار ہو رہی تھی۔ شجرِ زیست کے پتے ایک ایک کر کے گر رہے تھے۔ اس کا جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ لیکن تانیا کی یاد اب بھی ہڈیوں کے پنجر میں سمائی ہوئی تھی۔

"کوچنگ!"

"کہو شاعر"

"ذرا میرے قریب آ جاؤ!"

"پاس ہی بیٹھا ہوں"

"اور قریب آجاؤ!"

"لو بھیا!" کوچنگ شاعر کے بالکل قریب آگیا۔

"چند سانس باقی ہیں۔ زندگی کا رشتہ ختم ہو رہا ہے۔ خبر نہیں کس لمحے موت کا جھونکا چراغِ سحری کو گل کر کے رکھ دے۔ اس سے پہلے کہ میری ناشاد روح مٹی کے پتلے کو چھوڑ کر کہیں اور جا بسے۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ بھابھی جان تو تمہاری راہ نہیں دیکھ رہی ہوں گی۔" شاعر نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

"شاعر! کیوں دل دکھاتے ہو"

"میں اس دام گاہ کو چھوڑ رہا ہوں۔ تمہاری دنیا مجھے راس نہ آئی کوچنگ۔ یہاں کی ہر شے بذاتِ خود فریب ہے۔ ایک خوبصورت دھوکہ۔ اگر ہو سکے تو تم دنیا کو میرا سلام پہنچا دینا اور کہہ دینا کہ تمہارا شاعر تمہاری یاد کو پہلو میں دبائے ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو گیا ہے۔ خاک تھا۔ مٹی میں مل گیا ہے۔ بولو۔ کوچنگ جواب دو۔!!" شاعر نے کوچنگ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کوچنگ کے گالوں پہ آنسو بہنے لگے۔

"تم رو رہے ہو۔ مجھے دیکھو۔ میں ناکام ہو کر بھی ہنس رہا ہوں۔ مجھے دیکھو۔ میں ہنس رہا ہوں۔۔۔ میں ۔۔ ہنس" شاعر کی آواز گلے میں اٹک گئی۔ اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ جیسے وہ سو رہا ہے۔

"شاعر!!" کوچنگ چیخ مار کر شاعر سے لپٹ گیا۔ ہوائیں اسی طرح چل رہی تھیں۔

"تم شاعر کے دوست ہو نا؟ میں نے تمہیں ان کے ساتھ دیکھا ہے!" کوچنگ ایک دن اپنے مکان کے سامنے کھڑا تھا کہ ایک دوشیزہ اس کے پاس آئی۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ بانو"

"میں تمہارے دوست سے ملنا چاہتی ہوں"

"میرے دوست سے؟"

"ہاں۔ شاعر سے"

"شاعر سے۔ کس لئے"

"وہ میرے شاعر ہیں"

"بانو!" کوچنگ کچھ سوچ کر بولا

"تمہارا نام تانیا تو نہیں؟"

"ہاں میرا نام ہی تانیا ہے۔ کہاں ہے میرا شاعر؟" کوچنگ چپ رہا۔

"بولو تم خاموش کیوں ہو۔؟"

"خاموش کیوں ہوں" کوچنگ نے تیز نگاہوں سے تانیا کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ سہم سی گئی۔

"تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو" وہ ہمت کر کے بولی۔

"کیوں دیکھ رہا ہوں؟ کیا اس کا جواب بھی مجھے ہی دینا ہوگا۔" کوچنگ نے آگے قدم بڑھایا اور وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"میں اپنے شاعر کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔"

"شاعر۔ بہت جلدی خیال آیا" کوچنگ اور آگے بڑھا۔ لیکن تانیا بالکل نہ ہلی۔ کوچنگ کی نگاہیں تیز تھیں۔

"دور ہو جاؤ یہاں سے۔ جاؤ! چلی جاؤ!! جس گندگی سے نکل کر آئی ہو۔ وہیں واپس چلی

جاؤ۔ شاعر کا نام اپنی ناپاک زبان پر بھول کر بھی نہ لانا۔۔ ! سمجھی !!"

" میں کہیں نہیں جاؤں گی "

" میں کہتا ہوں۔ جاؤ " کوچینگ چلایا

" نہیں۔ نہیں۔ نہیں "

" نہیں "، کوچینگ نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا

" جاتی ہوں " تانیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

" میں چلی تو جاتی ہوں۔ لیکن شاعر سے اتنا کہہ دینا کہ تانیا تمہارے پاس پناہ لینے آئی تھی مگر ناکام چلی گئی۔ تو تم نے مجھ سے دھوکہ کیا۔ مگر شاعر سے مجھے یہ امید نہ تھی۔ کہ وہ بھی مجھے اسی طرح ٹھکرا دیگا۔ کاش ! شاعر دیکھتا کہ میرے ان گالوں پر جن کی وہ پوجا کرتا تھا۔۔ بے دردی سے تھپڑ پڑا ہے۔ تو وہ تڑپ جاتا۔ اس کی روح تک تڑپ جاتی۔ میں شاعر کی محبوبہ ہوں۔ گو کیسی بھی ہوں۔" تانیا چل دی۔

" تم شاعر کی محبوبہ ہو۔ میرے دوست کی " کوچینگ بڑبڑایا۔

" بہن۔ مجھے معاف کر دو۔ میں غصہ میں تھا۔ واقعی مجھے کوئی حق نہیں۔ کہ میں اپنے دوست کی محبوبہ کو جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔۔ ذلیل کر دوں۔ میں شاعر کی محبوبہ کا احترام کرتا ہوں " وہ تانیا کے حضور میں جھک گیا۔

" میرا شاعر کہاں ہے " تانیا آگے بڑھی

" تم چپ کیوں ہو گئے۔ کچھ تو کہو ! "

" وہ ہم سے روٹھ گیا "

" روٹھ گیا۔ تو کیا ہوا؟ ۔ میں اسے منالوں گی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اپنے سینے سے لگائے گا۔ میں اسے کہوں گی۔ شاعر! تمہارے گیتوں کی جان ۔۔ آج خود تمہارے قدموں میں قربان ہونے کے لیئے آئی ہے۔ لیکن بتلاؤ تو سہی وہ کہاں ہے؟ ۔ بولو! ۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ جلدی بتلادو۔ ورنہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

" یہ کیا کرتی ہو۔ تانیا۔" کوچنگ نے بازوؤں سے پکڑ کر تانیا کو اٹھالیا۔

" تو پھر بتلاتے کیوں نہیں؟"

" تانیا۔ وہ مرگیا۔" کوچنگ نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔

" نہیں۔ وہ نہیں مرسکتا۔ تم جھوٹ کہتے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔ مجھے میرے شاعر کے پاس لے چلو۔" تانیا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر کوچنگ کے قدموں پر گر پڑے

" لے چلو! ۔ مجھے اپنے شاعر کے پاس لے چلو!"

" چلیئے۔"

" یہ رہا تمہارا شاعر۔" قبر کی طرف کوچنگ نے اشارہ کیا

" میرا شاعر۔۔" تانیا کے لب ہلے۔

" میرے شاعر۔ میں آگئی۔ تمہاری تانیا آگئی۔ بولو شاعر! چھوٹی سی بھول کی اتنی بڑی سزا۔ کچھ تو بولو!! ۔ شاعر! ۔ لیکن تم تو مرگئے۔ مرنے میں بھی تم نے پہل کی نہیں۔ نہیں۔ تم نہیں مرسکتے۔ شاعر! شاعر!! ۔" شاعر کی محبوبہ چیخ مار کر قبر پر گر پڑی۔ ہوا سرسرائی اور قبر پر جھکے ہوئے درخت کے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر اس پر گرنے لگے۔

بیوہ سہاگن

"میں جلد ہی لوٹنے کی کوشش کروں گا۔"

دل سنگھ کمر کے گرد پٹکا باندھ کر نئی نویلی استری کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"لاجو!—"

"سوامی!—" سرخ گھونگھٹ کی اوٹ میں سے لاجو کی بمشکل آواز نکلی

"دل نہ ہارو! شہزادے نے کوچ کا حکم دے دیا ہے۔ وہ اپنے پتا سے مل کر جلد ہی واپس آجائیں گے۔"

لاجو، دل سنگھ کے پاؤں پکڑ کر رونے لگی

"میرے دل کے ٹکڑے نہ کرو۔" دل سنگھ نے لاجو کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور وہ اس کے سینے سے لگ گئی

"میں جانتا ہوں کہ ایک سہاگن جس کے ہاتھوں میں بیاہ کی لگی ہوئی مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی۔ اپنے پتی کو کالے کوسوں دور جاتے ہوئے کیسے دیکھ سکتی ہے۔

مجھے خود افسوس ہے کہ میں تمہیں چھوڑ کر پردیس جا رہا ہوں۔ تمہاری آشاؤں کا خون کر رہا ہوں۔ استری کو اس حالت میں چھوڑنا پاپ ہے۔"

"پھر کیوں ایسا کر رہے ہو؟"

"لاجو! ایک راجپوت کی غیرت کا سوال ہے۔ بھگوان کے لئے اپنے گرم گرم آنسوؤں سے میرے ان خیالات کو منتشر نہ کرو۔ جو کہ پشتوں سے وفا کے مرکز پر اکٹھے ہوتے ہوئے ہیں۔ میری رگوں میں ابلتا ہوا خون ہے۔ ٹھہرا ہوا سرد پانی نہیں۔ تم میری جیون پھلواری کی بہار ہو۔ لیکن یہ بھی تو سوچو وہ میرے آقا ہیں۔ جن کے مجھ اکیلے پر ہی نہیں بلکہ ہم دونوں پر احسانات ہیں۔ اس وقت اگر میں نے اپنے آقا سے منہ موڑ لیا تو ایک وقت ایسا آئے گا۔ کہ مجھے اپنے آپ سے شرم آئے گی اور میں تمہارے سامنے کھڑا بھی نہ ہو سکوں گا۔ تمہارا امنگوں بھرا دل ٹوٹ جائے گا۔ اور تم۔ تم خود پتی کی غداری پر لعنت ملامت کرو گی۔ لاجو! میں نے نمک کھایا ہے۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں نمک حرام کہلاؤں؟۔ میرے ساتھی باتیں بنا بنا کر میرا جینا دوبھر کر دیں۔ تم یہ سب کچھ کیسے برداشت کر سکو گی۔ میں چاہتا ہوں۔ کل کوئی تم پر انگلی بھی نہ اٹھا سکے سکھیوں میں تمہارا سر اونچا رہے۔ ہمیشہ۔"

"میں تو داسی ہوں"

"مجھے اپنے فرض کا احساس ہے۔ میں جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گا"

"میری بائیں آنکھ، پتہ نہیں کیوں بار بار پھڑک رہی ہے۔"

"یہ سب وہم ہیں۔ میری تلوار؟۔"

لاجو نے لپک کر کونے میں رکھی ہوئی تلوار اٹھائی اور اپنے خاوند کی کمر میں باندھنے

لگی۔

"اچھا لاجو رخصت۔" دل سنگھ نے ایک ہاتھ سے دوپٹہ ہٹا کر اپنی لاجو کی پیشانی چوم لی۔

"ٹھہریئے"۔ لاجو کی آواز بھرا گئی۔ اور دل سنگھ کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے لاجو جلدی سے چولہے کے قریب رکھا ہوا دودھ کا گلاس اٹھا لائی اور دل سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔ دل سنگھ نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

"شیر سنگھ کو میں نے کہہ دیا ہے۔ اس کی دھرم پتنی تمہاری دیکھ بھال کے لئے آتی رہے گی۔" دل سنگھ یہ کہتا ہوا مکان سے نکل گیا۔ لاجو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

کوچ کا بگل بجا۔ بگل بجتے ہی سپاہیوں کی مختلف ٹولیاں ادھر ادھر سے نکل کر کھلے میدان میں جمع ہونے لگیں۔ سرداروں اور کمانداروں نے اپنے اپنے دستوں کو ترتیب دیا۔ اور شہزادہ اورنگ زیب تنکبرے گھوڑے پر بیٹھا ہوا، خوبصورت اور سجیلے نوجوانوں پر مشتمل دستۂ خاص کے جلو میں نمودار ہوا۔

چست و چالاک نوجیوں اور چاق و چوبند سپاہیوں نے اپنے شہزادے کو دیکھتے ہی فرطِ مسرت سے نعرہ لگایا۔ فوجی بگل ایک بار پھر بجا۔ لشکریوں کی ٹولیاں اشکبار آنکھوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آہستہ آہستہ روانہ ہوئیں۔ صیقل شدہ ہتھیاروں کی چمک دمک کے ساتھ ساتھ فضا میں لہراتے ہوئے پھریرے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ حسین پہاڑیاں دور تک چلی گئی تھیں۔

۱۶۵۸ء کی بوڑھی فروری آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ شام کا سورج ڈھلتے ڈھلتے زمین کی چھاتی سے جا لگا تھا۔ جسونت سنگھ شاہی لشکر کے ہمراہ اجین کے

مقام پر آکر ٹھہر گیا۔ کھلے میدان میں خیمے نصب کر دیئے گئے۔ راجہ جسونت نے اپنی کمر کھولی اور تھکے ہارے سپاہی بستروں پر گر پڑے۔

چند گھوڑے سوار جسونت سنگھ کے خیمے کے سامنے آکر رکے۔ پہرے دار ایک طرف ہٹ گئے۔ اور وہ بے دھڑک اندر چلے گئے۔

"کیا خبر لائے؟"

"بہت بری سرکار" ڈواردوں میں سے ایک جھک کر بولا۔

"شہزادہ مراد بھی گجرات سے روانہ ہو پڑا ہے۔"

"ہوں۔ تم جا سکتے ہو۔" خیمہ خالی ہو گیا۔ جسونت سنگھ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے رکھ کر اضطراب کی حالت میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اور پھر باہر نکل گیا۔

شاہی لشکر میں پھر کوچ کا بگل بجا۔ اور سپاہی جلدی جلدی خیمے اور چھولداریاں اکھاڑنے لگے۔ چند ہی ساعت میں آباد جگہ۔ عاشقِ ناکام کے دل کی طرح ویران ہو گئی۔ کہیں کہیں ادھ جلی لکڑیوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

شہنشاہی فوجیں خاک کے بادل اڑاتی ہوئیں کچراد کے مقام پر پہنچیں اور مراد کا راستہ روک کر پڑ گئیں۔ جاسوس متفرق سمتوں کو روانہ ہو گئے۔ شہزادہ مراد، جسونت سنگھ کے لشکر سے ۳۷ میل کے فاصلے پر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ وہ شاہی لشکر کے تزک و احتشام اور برتری سے بخوبی واقف تھا۔ اور جانتا تھا۔ کہ ملک کے چیدہ چیدہ سپاہی للکارنے کے لئے نکلے ہیں۔

اس نے آگے بڑھنے کی بجائے اپنے بھائی شہزادہ اورنگ زیب کا انتظار کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ جسونت سنگھ ابھی سانس بھی نہیں لینے پایا تھا۔ کہ اسے شہزادہ

اورنگ زیب کے مالوہ پہنچنے کی خبر ملی۔ خبر پہنچنے پر وہ فوراً کوچ کرتا ہوا اجین پہنچا۔

"مہاراج!۔ شہزادے کی جانب سے کوی رائے برہمن پدھار رہے ہیں"

راجپوت سپاہی نے خیمہ میں داخل ہو کر ہاتھ باندھ کر سلام کیا۔

"آنے دو!" ۔ جسونت سنگھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کوی رائے برہمن اندر داخل ہوا۔ اس نے پہلے شاہی رسوم کے مطابق سلام کیا اور پھر شہزادہ کا مراسلہ جسونت سنگھ کے ہاتھ میں تھما کر ادب سے سر جھکاتے ہوئے ایک طرف کھڑا ہو گیا

"جسونت!"

ہم تمہاری عزت کرتے ہیں۔

والدِ محترم اور ہمارے درمیان لوہے کی دیوار بن کر کھڑے ہونے کی کوشش نہ کرو۔ بزرگوں کی زیارت کے لئے ہم بہت ہی بے چین ہیں

سرکشی دماغ سے نکال دو!۔ اور یہ راہ چھوڑ کر جودھپور چلے جاؤ۔ ہم بغیر کسی جھگڑے کے آگرہ پہنچنا چاہتے ہیں"

"نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں آقا کے حکم سے کسی حالت میں بھی منہ نہیں موڑوں گا"

"کوی ۔ رائے! تم جا سکتے ہو۔!" شہزادے کا پیغامبر خیمہ سے نکل گیا۔ راجہ جسونت سنگھ نے شہزادہ کو روکنے کے لئے دھرمت کے مقام پر اپنی فوجیں پھیلا دیں۔ اور تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا۔

شاہ جہاں کے علم بردار ابھی آرام سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ شہزادہ اورنگ زیب اور شہزادہ مراد کے ایک جھنڈے تلے جمع ہونے کی خبر پہنچی۔ جسونت بوکھلا گیا۔

"کیا ہوگا؟ ۔ مقابلہ کیسے ہو؟ ۔ تیموری خون رگوں میں رکھنے والے دو شہزادوں نے مخالفت پر کمر باندھی ہے ۔ آن کس طرح قائم رکھی جائے؟ میدان کس طرح جیتا جائے ۔؟؟" ۔ اس کے دماغ میں عجیب عجیب خیالات آنے لگے ۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے دبیر بلایا ۔ اور شہزادہ اورنگ زیب کی خدمت میں معافی نامہ لکھوا کر قاصد کے ہاتھ روانہ کیا ۔

قاصد برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر دور تک پھیلے ہوئے خیموں کے درمیان میں سے گزرتا ہوا کھلی سڑک پر پہنچا اور گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں ۔ گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا ۔

شہزادہ اورنگ زیب جسونت سنگھ کی چال کو سمجھ گیا ۔ اور اس نے درخواست مسترد کر دی ۔ وہ جانتا تھا کہ جسونت وقت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت بڑھانے کی فکر میں ہے ۔ اسے شاہی کمک کا انتظار ہے ۔

" اگر تم واقعی لڑنا نہیں چاہتے ۔ تو اکیلے نجابت خاں کے پاس چلے آؤ ۔ وہ تمہیں ہمارے بیٹے محمد سلطان کے پاس پہنچا دے گا ۔ تم محمد سلطان کی معیت میں ہمارے حضور میں پیش ہو تو ۔ معاف کر دئیے جاؤ گے ۔" شہزادہ نے چند سطور لکھ کر جسونت سنگھ کے قاصد کے حوالے کیں ۔ قاصد ہوا سے باتیں کرنے لگا ۔

" کہو ! فلک شیر ۔" قاصد کو دیکھتے ہی جسونت سنگھ نے کہا ۔ قاصد نے سلام کر کے اورنگ زیب کا مراسلہ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا ۔

راٹھوڑ سردار کے تن میں آگ لگ گئی ۔ شہزادہ کے اس جواب کو اس نے اپنی بعزتی سمجھا ۔ وہ شاہجہان کے فرمان کے مطابق دونوں شہزادوں کو پرامن طریقے سے

واپس لوٹانے کے لیۓ روانہ ہوا تھا۔ لیکن وہ بضد تھے۔ واپس لوٹنے کو تیار نہ ہوۓ۔ جسونت مجبوراً اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھا۔

اور اس تاروں کی ٹولیاں آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرنے لگیں۔ رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ جانباز سپاہیوں کی متوالی آنکھوں میں نیند سمانے لگی۔ دل سنگھ بستر پر دراز پہلو بدل رہا تھا۔ لاجی کی یاد نے اس کی نیندیں چرالی تھیں۔ شہزادہ اورنگ زیب ضروری احکامات صادر کر کے اپنے خیمہ میں بیٹھا یادِ الٰہی میں مشغول تھا۔

شاہی فوجیں حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ لکڑیوں کے الاؤ جل رہے تھے۔ اور طلائی دستہ گشت لگا رہا تھا۔ راجہ جسونت اپنے کشادہ خیمہ میں بیٹھا آنے والی صبح کے متعلق سوچ رہا تھا۔ چھوٹے بڑے سردار اس کے گرد بیٹھے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

"مہاراج!۔" ایک سردار اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا
"شہزادوں نے توپیں ہمارے سامنے نصب کر دی ہیں۔"

"جب مرنے کی ٹھان لی ہے۔ تو توپوں کا کیا غم؟" جسونت سنگھ نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تم نہیں جانتے؟۔ جب جوشیلے راجپوت بپھرے ہوۓ شیروں کی مانند کچھاروں سے نکلتے ہیں۔ تو توپوں کے رخ یوں پھیر دیتے ہیں۔ جیسے صحن میں کھیلتا ہوا بچہ کھلونے کو ایک جگہ سے اٹھا کر ہنستے ہنستے دوسری جگہ رکھ دیتا ہے۔ جیالے راجپوت اپنی زندگیوں کو خوشی خوشی قربان کرنا اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ بازو

آزمائے ہوئے ہیں۔ سورما کا بازو پر بھروسا ہونا چاہیئے۔ تم بھول رہے ہو۔ ہم نے دشمن سے مرعوب ہونا نہیں سیکھا۔ ہم آگے بڑھتے ہیں اور بڑھتے ہی رہتے ہیں جب موت منہ کھولے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ راجپوت بے خوف آگے بڑھتا ہے۔ اسے گھر کی یاد نہیں ستاتی۔ بیوی کی محبت اس کا راستہ نہیں روکتی۔ کل صبح جب کرنوں کی بارش ہوگی۔ ان تھک راجپوت چنگھاڑتے ہوئے ہاتھیوں کی طرح رن میں داخل ہوں گے۔ مچلتے ہوئے شہبازوں کی مانند دشمن پر جھپٹیں گے۔ اور پیچھے بھی نہ دیکھیں گے۔

ان ویروں کو کوئی طاقت ان کے فرض سے نہ ہٹا سکیگی۔ شہزادوں کی گرجتی ہوئی توپیں گرج گرج کر ہار جائیں گی۔ اور وفادار سپاہی لہو کی سرخ سرخ چادریں دھرتی کی ننگی چھاتی پر بچھاتے ہوئے بڑھتے ہی رہیں گے۔"

"مہاراج یہ تو صحیح ہے۔" ایک اور سردار نے ادب سے کھڑے ہو کر کہا۔

"پر سورماؤں کا خون پیاسی دھرتی کے چاٹنے کے لئے کیوں گروایا جائے۔ آپ اجازت دیں۔ تاکہ میں ان ہی ویروں میں سے چار ہزار جواں مرد ساتھ لے کر آدھی رات کے سمے دشمن پر ٹوٹ پڑوں اور سورج کی پہلی کرن کے جنم لینے سے پہلے پہلے گولہ اندازوں کا صفایا کر کے توپوں کو اپنے قبضے میں لے آؤں۔ اس کے بعد میدان صاف ہوگا۔ ہم ہوں گے اور ہمارا دشمن۔ برنا کھلے میدان میں ویروں کو شوبھا دیگی۔"

"یہ راجپوت کی آن کے خلاف ہے۔ کہ وہ چوروں کی طرح چھپ کر حملہ کرے۔ ہم للکار کر لڑنے والے ہیں۔ سلا کر ذبح کرنے والے نہیں۔ ہم جتلا کر شیروں کی مانند پورا وار کرتے ہیں۔ بزدلوں کی طرح دبک کر اوچھا ہتھیار نہیں پھینکتے۔ صبح سویرے جب

پنچھی بسیروں سے اڑیں گے - میں وہ چال چلوں گا - کہ دشمن کی سب تدابیر مٹی میں مل جائیں گی - توپیں بے کار ثابت ہوں گی اور میدان ہمارا ہو گا -

اب تم جا سکتے ہو"

"جو حکم -" عسکران (کرنی وانت) پیچھے ہٹ گیا - مجلس برخاست ہوئی - سورما ایک ایک کر کے خیمے سے نکل گئے - اور جسونت سنگھ کافی رات گئے تک جاگتا رہا -

پہاڑوں پر کھڑے ہوئے چیل کے درختوں کے سنگ ہوا کھیلنے لگی - دیوتاؤں نے مسکرا کر انگڑائیاں لیں - سورج جھومتا ہوا اُنگی چوٹیوں کے پیچھے سے نمودار ہوا - اور کرنیں بڑھ بڑھ کر ناچنے لگیں - دونوں لشکروں میں ہل چل مچ گئی -

راجہ جسونت سنگھ پچاس ہزار فولاد میں ڈوبے ہوئے جنگجوؤں کو لے کر شاہی رعب و داب کے ساتھ ایک شان سے آگے بڑھا - اور پڑاؤ سے کچھ آگے بڑھ کر لشکر کو ترتیب دینے لگا -

شاہی فوج کو دیکھتے ہی شہزادہ اورنگ زیب اپنے تیس ہزار وفاداروں کے ساتھ اپنی جگہ سے ہلا - اور مراد دس ہزار دلاوروں کو لے کر آگے بڑھا - اورنگ زیب نے بہادروں اور سرداروں کی جگہیں خود مقرر کیں - شہزادہ محمد سلطان اور نجابت خاں آٹھ ہزار نوجوانوں کی چادروں میں چھپے ہوئے نوجوانوں کے ساتھ دیوارِ چین بن کر کھڑے تھے - ذوالفقار خاں توپوں کو لے کر شہزادہ محمد سلطان اور نجابت خاں سے کچھ آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا - عام توپیں مرشد قلی خاں کے تحت نصب - فوج کا دایاں بازو شیخ میر کے زیرِ کمان تھا - اور بایاں بازو ملتفت خاں اور شہزادہ معظم کے اشارہ کا منتظر تھا - مرتضیٰ خاں فوجِ خاصہ اور اورنگ زیب کے حفاظتی دستوں

کے ساتھ اپنی جگہ پر ایستادہ تھا۔ شہزادہ اورنگ زیب نے قلب اپنے لئے چنا۔ تیغ ہیر اور صف شکن فوج کے دائیں اور بائیں بازوؤں کی حفاظت کے لئے کچھ توپوں کے ساتھ مقرر ہوئے۔

سامنے شاہی فوجیں اپنی روایات کو حیاتِ نو بخشتی ہوئی ٹھاٹ باٹ سے میدانِ جنگ میں جچی تلی کھڑی تھیں۔ جسونت سنگھ نے فوج کے ہراول کو دس ہزار فولاد سے ڈھکے ہوئے سورماؤں کے ساتھ سنوارا۔ اس کا ایک حصہ قاسم خاں کے سپرد تھا۔

فوج کا دایاں بازو مکند سنگھ ہاڑا اور چھ دوسرے راجپوت سرداروں کے زیرنگیں ہزارہا راجپوت ویروں پر مشتمل تھا۔ اور بایاں بازو مسلم افواج اور دیگر درباری معززین کے ساتھ افتخار کے زیر کمان دور تک چلا گیا تھا۔ پھیلے ہوئے سپاہ کے قلب میں جسونت سنگھ خود اپنے قبیلے کے دو ہزار راٹھوڑ سورماؤں کو لئے ہوئے راجپوتی شان سے کھڑا تھا۔۔۔ شاہی دستے اس کے پیچھے شیطان کی آنت کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ ریزرو گارڈ اور راٹھوڑ راجپوت سرداروں کے چارج میں تھے۔ کیمپ اور دوسرے سامان کی حفاظت کے لئے مالوجی اور پرسوجی مرہٹہ راجے، دیوی سنگھ بندیلہ کے ساتھ تعینات تھے۔ اس عظیم الشان لشکر میں راٹھوڑ اور مسلم دلیروں کے علاوہ وسط ایشیا کے تجربہ کار اور جنگجو لوگ بھی شامل تھے۔

سورج دو گھنٹے کی مسافت طے کر کے کچھ اور اوپر چڑھ گیا۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے آکر تن گئیں۔ ایک شور برپا ہوا۔ اور توپوں کی گرج کے ساتھ لڑائی کا آغاز ہوا۔ توڑے دار بندوقوں اور راکٹس کا آزادانہ استعمال ہونے لگا۔ متفرق سازوں کی آواز فضا میں پھیلی۔۔ دلاور و جنگجو ایک دوسرے کی طرف جھپٹے۔ اور راجپوت جیالے بے خوف

شیروں کی مانند دشمن پر دھاڑتے ہوئے ٹوٹ پڑے۔

شہزادہ اورنگ زیب کی توپیں دندنا رہی تھیں۔ اور یورپین گولہ انداز پھرتی سے توپوں کا رخ پھیر پھیر کر راجپوت سورماؤں کو آگ اور دھوئیں میں لپیٹ رہے تھے۔ چند ہی منٹ میں راجپوتوں کی بھاری تعداد دھماکوں کے ساتھ اڑ گئی۔ گھوڑسوار توپوں کی گرج کے ساتھ چاروں شانے چت گر کر لوٹنے لگے۔ چیخ و پکار سے میدان گونج رہا تھا۔ اور توپیں آگ اگل رہی تھیں۔

راجپوت نوجوانوں کو یوں آگ کی بھینٹ چڑھتا دیکھ کر راجپوت سرداروں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مکند سنگھ ہاڑا اور رتن سنگھ راٹھوڑ اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑے دوڑاتے ہوئے دشمن کی صفوں کی طرف تیزی سے بڑھے۔ دیال سنگھ جھالا ارجن سنگھ گور، سوجان سنگھ سسوڈیا اور دوسرے راجپوت سردار یہ رنگ دیکھ کر اپنے سپاہیوں کو للکارنے لگے۔ انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور پکارتے ہوئے مخالف سپاہ پر ٹوٹ پڑے۔ مرشد قلی خاں (چیف آف آرٹیلری) مرد میدان کی طرح آگے بڑھا اور ہٹیلے راجپوتوں کے بڑھتے ہوئے طوفان سے کھیلنے لگا۔ جانباز توپچیوں نے اپنے آقا کی پیروی کی۔ دو طوفان ٹکرائے۔ راجپوتوں کا تانتا بندھ گیا۔ اور وہ مرشد قلی خاں کی طرف پلٹ پڑے۔ مرشد نے دلاوری کے جوہر دکھائے۔ اس نے راجپوتوں کے گھیرے کو توڑ کر پار نکلنا چاہا۔ مگر کچھ بن نہ پڑی۔ آخر مردانہ وار لڑتا ہوا سینے پر لاتعداد زخم کھا کر زمین پر گر پڑا —— وفا کا سر اونچا ہو گیا۔

مرشد قلی خاں کے زمین بوس ہوتے ہی راجپوتوں کا بڑھتا ہوا طوفان توپچیوں کو منتشر کرتا ہوا اورنگ زیب کے مددگار ہراول دستوں کی طرف بڑھا۔ اور سپاہی

ہچکچائے۔ ذوالفقار علی خاں فرنٹ کمانڈر نے اپنے دلاوروں کو جی چراتے ہوئے دیکھ کر للکارا۔ اور خود ہاتھی سے اتر کر نہتا دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ ساتھیوں کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے بڑھتے ہوئے طوفان کو تلواروں کی باڑھ پر روک لیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ سینکڑوں انسان چشم زدن میں کٹ کٹ کر گر پڑے۔ ذوالفقار خاں کے بازو دشمن کو کاٹتے کاٹتے شل ہو چکے تھے۔ اس کے جسم پر دو گہرے زخم لگے اور وہ دادِ شجاعت دیتا ہوا فرشِ خاک پر گر پڑا۔

راجپوت چنگھاڑتے ہوئے ہاتھیوں کی مانند ہراول دستوں کو تہ و بالا کر کے فوج کے قلب میں گھس گئے۔ ترتیب قائم نہ رہی۔ اور وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں منقسم ہو کر لڑنے لگے۔ صیقل شدہ ہتھیار خون میں بھرے ہوئے تھے۔ اور سورج کی کرنیں لہو کے قطروں کو چاٹ رہی تھیں۔ فوجیوں کو ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔ اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہاتھ چلا رہے تھے۔

شہزادہ اورنگ زیب نے میدان کا رنگ دیکھ کر بہادروں کو پکارا۔ شہزادہ کا ہراول دستہ جس میں خاندانی افغان دلیروں کے علاوہ آٹھ ہزار فولاد پوش نوجوان بھی شامل تھے۔ قابلِ اعتماد شخصیتوں کے سائے میں آگے بڑھا۔ محمد سلطان۔ نجابت خاں اور کئی سردار، دشمن کی سرکش لہروں کے سامنے ہاتھیوں کے ساتھ اٹل چٹانیں بن کر کھڑے ہو گئے۔ لہریں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ زمین خون پینے لگی۔ ہاتھ اور سر اچھل اچھل کر ادھر ادھر گرنے لگے۔ قوی دل جوانوں کے چہروں پر پسینے کے قطرات کی بجائے لہو کے چھینٹے رینگ رہے تھے۔

رہے سہے راجپوتوں کو قلب اور ریزرو فوج سے معمولی سی مدد پہنچی۔ انہوں نے

ہاری ہوئی بازی کو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر پھر جیتنا چاہا۔ مگر شہزادہ اورنگ زیب کے جری اور آزمودہ کار سرداروں کے سامنے کچھ پیش نہ گئی۔ اور نڈر راجپوت اپنے گھروں سے دور، شاہجہاں کے نام کی برتری کی خاطر ایک ایک کر کے کٹ مرے۔۔ تقدیر یہیں رہی تھی۔

شاہی ہراول یعنی مغلوں پر مشتمل دستے جو قاسم خاں کے زیر کماں تھے۔ کھڑے دیکھتے رہے۔ راجپوت جواں کٹ گئے۔

شہزادہ اورنگ زیب نے اپنی تجربہ کار نگاہوں کو چاروں طرف دوڑایا۔ اور ریزرو فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ آقا کا دم بھرنے والے سپاہی آگے بڑھے۔ اورنگ زیب بہ نفسِ نفیس دشمن پر پل پڑا۔ اور چھپٹ جھپٹ کر وار کرنے لگا۔ اپنے شہزادے کو بیجگری سے لڑتے دیکھ کر فوجیوں کے حوصلے بڑھے۔ اور وہ بھی بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے۔۔ دل سنگھ اپنے آقا کے سائے میں بے خوف لڑ رہا تھا۔ بچے کھچے راجپوتوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ شیخ میر اور صف شکن خاں جنہوں نے ابھی تک لڑائی میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ اپنے لڑاکے ہمراہیوں کے ساتھ تلواریں سونت سونت کر آگے بڑھے اور آؤ دیکھا نہ تاؤ فریقِ دوئم پر ٹوٹ پڑے۔ تلواریں تلواروں سے ٹکرا رہی تھیں اور تیر پتوں کی طرح گر رہے تھے۔ مکند سنگھ ہاڑا ڈٹ کر مقابلہ کر رہا تھا۔ ایک تیر سنسناتا ہوا آیا۔ اور اس کی آنکھ میں گھس گیا۔ وہ وہیں گر پڑا۔

مکند سنگھ ہاڑے کے گرتے ہی باقی سردار بھی ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔ اور راجپوتوں کے گرم گرم خون سے پیاسی زمین کی جلتی ہوئی چھاتی ٹھنڈی پڑ گئی۔ لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔

جسونت سنگھ قلب میں کھڑا تھا۔ کہ اورنگ زیب کی اونچی جگہ پر نصب کی ہوئی توپیں گرجنے لگیں۔ شاہی سپاہی خاک کے ساتھ ساتھ اڑنے لگے۔ رائے سنگھ سسوڈیا، سبھا چند بندیلہ اور امر سنگھ چندراوٹ نے میدان چھوڑ دیا اور واپس لوٹ گئے۔ راجہ جسونت نے انہیں ہٹتے ہوئے دیکھا۔ لیکن وہ ہراساں نہ ہوا۔ اس کی کمر ہمت نہ ٹوٹی۔ وہ مارواڑ کے جھنڈے تلے دو ہزار راٹھوڑوں اور چند سرداروں کے ساتھ اسی طرح مرنے مارنے پر ڈٹا رہا شہزادہ مراد اپنے سپاہیوں کو لے کر قلب پر آگرا۔ مراد کے جنگ میں شامل ہوتے ہی لڑائی چہار طرف شروع ہو گئی۔ دونوں بھائی بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ لڑائی جوبن پر تھی۔ ہر طرف زخمیوں کی چیخ و پکار لڑنے والوں کو جوش دلا رہی تھی۔ آسمان پر دھواں سا چھا رہا تھا۔ اور زمین لاشوں سے اٹی پڑی تھی۔

شہزادہ مراد دشمن کو کاٹتا ہوا بائیں بازو کی طرف پلٹا اور باغی آندھیوں کی طرح میدانِ کارزار پر چھا گیا۔ افتخار خاں نے بائیں بازو کو بچانے کے لیے بڑی کوشش کی مگر تمام دن لڑتے رہنے کی وجہ سے تھک کر چور ہو چکا تھا۔ مراد کی تازہ دم فوج کے سامنے وہ نہ ٹھہر سکا۔ اور لڑتا ہوا مارا گیا۔ افتخار خاں کے گرتے ہی بائیں بازو نے ہمت ہار دی۔ سپاہی پسپا ہونے لگے۔

جسونت سنگھ کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ وہ ننگی تلوار ہاتھ میں لئے آگے بڑھا۔ راجپوت سپاہی اپنے سردار سے لپٹ گئے۔ اور اسے یوں جان دینے سے روکنے لگے۔ راجہ جسونت چار گھنٹے جانبازی سے لڑا۔ آخر عسکران مہیش داس۔ گوردھن اور دیگر امراء نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کھینچ کر لے گئے۔

اورنگ زیب سامنے سے، مراد بائیں بازو سے اور صف شکن دائیں بازو

سے دشمن کو کاٹتے ہوئے آگے بڑھے۔ ہلڑ سا مچ گیا۔ شاہی فوج میں ابتری پھیل گئی اور سپاہی کھسکنے لگے۔ اورنگ زیب اور مراد بخش کی فوجوں نے نعرے لگائے۔ شاہی فوجیں میدان چھوڑ کر بھاگ رہی تھیں۔ فاتح سپاہیوں نے بھگوڑوں کا تعاقب کرنا چاہا۔ لیکن شہزادے اورنگ زیب نے روک دیا۔ اور وہ لاشوں کو روندتے ہوئے شاہی کیمپوں میں گھس گئے۔ شہزادہ اورنگ زیب اسی وقت گھوڑے کی پیٹھ پر سے کودا اور زمین پر پیشانی رکھ کر فتح دینے والے کے سامنے گڑگڑانے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

لاتعداد توپیں، ان گنت خیمے، جھولداریاں، گولہ بارود۔ سامان رسد، ہاتھی گھوڑے اور بے پناہ مال و خزانہ فاتح شہزادوں کے ہاتھ لگا۔ قاسم خاں اور جسونت سنگھ کے کیمپ میں متفرق چیزوں سے لدے ہوئے اونٹ عام سپاہیوں کے ہاتھ لگے۔

جسونت، اورنگ زیب کے سامنے ناکام ثابت ہوا۔ اورنگ زیب کی دھاک قرب و جوار میں بیٹھ گئی۔ اس نے ایک ہی ٹکر میں دارا کی شان و شہرت کو خاک میں ملا دیا۔ دکن کی جنگوں کے ہیرو اور دھرمت کے فاتح اعظم نے پہلے ہی وار میں ثابت کر کے رکھ دیا۔ کہ ہندوستان بھر تو کیا دور دور تک اس کا ثانی نہیں۔ اس سے منہ موڑنا، زندگی سے ہاتھ دھونا ہے۔ تقدیر کے منہ پر طمانچہ مارنا ہے۔

نصرت کے شادیانے بجنے لگے۔ لڑاکے جوانوں کے دلوں میں امید کی کرن جگمگا اٹھی۔ نیرنگی چھٹنے لگی۔ اورنگ زیب نے بڑھ کر مراد کو سینے سے لگا لیا۔ امراد اعیان

جمع ہو گئے۔ مراد کو پندرہ ہزار سونے کے ٹکڑے، چار ہاتھی اور لاتعداد تحائف ہزار ہا مبارکبادیوں کے ساتھ اسی وقت پیش کئے گئے۔ شہزادے اورنگ زیب نے اس فتح کی خوشی میں فتح آباد، آباد کرنے کا حکم دیا۔ مسجد کی بنیاد اپنے ہاتھوں رکھی اور شام کی نماز اپنے ساتھیوں کے ساتھ ادا کی۔ نڈر شہزادہ۔ سورماؤں کے سامنے سر کو بلند رکھنے والا جوان مالکِ حقیقی کے روبرو فرشِ خاک پر ماتھے کو رکھے عجز کا اظہار کر رہا تھا۔

جاں بلب شام تیرگی کے کنارے سے لگی۔ نزع کی آخری گھڑیاں گزار رہی تھی۔ تقدیر کی پیشانی پر زمانے نے بدبختی کی کالک مل رہی تھی۔ ہر سو اندھیرا چھا رہا تھا۔ فاتح سپاہی میدانِ رزم میں لاشوں کے درمیان پڑے ہوئے زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر ان کے زخموں پر مرہم لگا رہے تھے۔ اور مردوں کو ٹھکانے لگایا جا رہا تھا۔

زخم خوردہ فوجی دور تک پڑے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ لاشوں کے انبار لگے تھے۔ دل سنگھ میدان کے کنارے کھڑا پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ لاجو کی یاد اس کے دل میں درد پیدا کر رہی تھی۔ وہ بے جان سپاہیوں کے آس پاس ٹہلنے لگا۔ اور ٹہلتا ٹہلتا جسونت سنگھ کے اجڑے ہوئے کیمپ میں پہنچ گیا۔ جیتنے والے ہنس رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھتا ہوا قریب سے گزر گیا۔ اور چھولداریوں کے درمیان سے چلتا ہوا کیمپ کے دوسرے سرے پر جا نکلا۔ سامنے تاریکی پر پھیلائے آنکھیں دکھا رہی تھی۔ چند منٹ وہاں ٹھہرنے کے بعد دل سنگھ مڑا۔ اور لکڑیوں کے جگہ جگہ سلگتے ہوئے الاؤ کو

گھورتا ہوا واپس چل دیا۔ اس کی طبیعت مضمحل تھی۔ لاجو نہ جانے آج کیوں اسے بہت زیادہ یاد آ رہی تھی۔

کیمپ کو چیر کر وہ پھر مردوں کی بستی میں آگیا۔ ہاتھ پاؤں اور سر جگہ جگہ کٹے ہوئے پڑے تھے۔ سرکشوں کی گردنیں تن سے جدا تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ آیا۔ اور وہ دھرتی کی چھاتی پر پڑے ہوئے دم توڑتے، ہچکیاں لیتے۔ جوانوں کو سرسری نگاہ سے دیکھتا ہوا چل دیا۔

"پانی۔ پانی!!" ایک قریب المرگ سپاہی کی آواز پر وہ چلتا چلتا ٹھٹھر گیا۔

"آہ پانی۔" دلسنگھ جلدی سے آواز کی طرف لپکا۔ ایک فوجی زمین پہ پڑا کراہ رہا تھا۔ اس نے قریب بیٹھ کر آہستہ سے اس کا سر اُٹھایا۔ اور اپنے گلے میں پڑی ہوئی چھاگل اتار کر اس کے منہ سے لگادی۔

غٹ۔ غٹ۔ چھاگل کے منہ سے پانی نکل کر اس کے حلق میں جانے لگا۔ پانی کے اندر داخل ہوتے ہی سپاہی کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اور پانی اس کے حلق سے نیچے لگے ہوئے زخم میں سے نکل کر اس کی چھاتی پر بہتا ہوا زمین پہ گرنے لگا۔ دل سنگھ کا ہاتھ بھیگ چکا تھا۔ اس نے مردہ سپاہی کا سر زمین پر رکھ دیا۔ اور اپنے ہاتھ کو جھٹکتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ کافی دیر تک وہ یونہی گم صم کھڑا رہا۔

مغربی کونے میں چند تارے نمودار ہو کر ٹمٹمانے لگے۔ دل سنگھ نے ایک آہ بھری۔ اور لاشوں کے درمیان میں سے گزرنے لگا۔ وہ کئی جگہ ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔۔۔۔ گھومتے پھرتے وہ اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں کچھ دیر پہلے شاہی قلب قائم تھا۔ یہاں ابھی تک زخمی پڑے ہوئے تڑپ رہے تھے۔ دل سنگھ ان کی طرف توجہ دئے بغیر آگے بڑھ

گیا۔ اس کا پاؤں ایک سپاہی کے سر پر پڑا۔ اور وہ ہلکی سی چیخ مار کر اُچھلا۔ اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ اس نے سہم کر چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ اور آگے قدم بڑھا دیا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلنے پایا تھا۔ کہ لاشوں کے درمیان پڑے ہوئے شاہی جھنڈے سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ چند قدم کے فاصلے پر فاتح فوج کے سپاہی لاشوں کے درمیان گھوم رہے تھے

دل سنگھ آج بہت ہی اداس تھا۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ ہمت کر کے اٹھا۔ اور بغیر سوچے سمجھے ایک طرف چل دیا۔ چلتے چلتے اس کا پاؤں پھر ایک نیم مردہ سپاہی کے سینہ پر پڑا۔ اور وہ ایکا ایکی ٹھہر گیا۔ زمین پر پڑے ہوئے سپاہی نے قریب پڑی ہوئی تلوار اٹھائی اور دل سنگھ کے پیٹ میں گھونپ دی۔ دل سنگھ چکرا کر زمین پر گر پڑا۔

فاتح فوج خوشیاں منا رہی تھی۔ دل سنگھ کی مردہ نگاہیں تاریکی میں لاجو کو تلاش کر رہی تھیں۔ اور لاجو دور بیٹھی اپنے مانگ کی زندگی کی بھیک دیوتاؤں سے مانگ رہی تھی۔۔۔ دیوتا خاموش تھے ۞

آزاد رُوحیں

ڈرامہ کے کردار

ارواح	
لیڈر	بھولی بھالی صورت
ایم ایل اے	اب تک پڑھا ہؤا
مجسٹریٹ	نوکدار بڑی بڑی مونچھیں
وکیل	تیز آواز کرزن فیشن مونچھیں
تھانیدار	بہت ہی پھولا ہؤا
ڈاکٹر	داڑھی مونچھ صاف
فلاسفر	بال بڑھے ہوئے
کلرک	تپلا تیلا گال پچکے ہوئے
پٹواری	گھنی داڑھی

ماسٹرجی — خمیدہ کمر، چہرہ پر چشمہ پرانا

دکاندار — پیٹ بڑھا ہوا بدن پر جگہ جگہ میل

چپڑاسی — دانت صاف

ایکٹر — داڑھی مونچھ سے بے نیاز، سر کے بال پیچھے سے بڑھے ہوئے اور کچھ ماتھے پر پڑے ہوئے۔

نوجوان — خوبصورت جسم۔ سر پر خون میں رنگی ہوئی پٹی بندھی ہوئی

منظر:۔ کہر کے بکے۔ دھندلا دھندلا سا چاند۔ قبرستان میں چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ روحیں سفید سفید اور ڈھیلے ڈھالے کفنوں میں ملبوس قبروں سے نکلتی ہیں۔ اور ایک جگہ جمع ہو کر عجیب عجیب بولیاں بولتی ہیں۔ زور زور سے ہنستی ہیں۔ کودتی ہیں اور اچھلتی ہیں۔

ارواح:۔ ایخ سخ خ۔ خ۔ خ۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ او ہو ہو ہو ہو۔ اخ خاخا خا
ای ھی ھی ھی۔ ہاہا ہو ہو ہاہا۔ اخاہ۔ اخاہ۔ خاہ۔ اخاہ۔ اہا۔ ہاہاہا۔
اے ہے ہے ہے ہے۔ ہو ہو ہو ہو۔ ہے ہے ہے ہاہا۔ ہا

لیڈر۔ (ہنستی کودتی روحوں کے درمیان کھڑے ہو کر زور زور سے چیختے ہوئے) ٹھہرو! ٹھہرو!! خدا کے لئے ٹھہرو!۔ ارے میں لیڈر ہوں — تمہارا محبوب راہنما۔ دیکھو۔ ٹھہرو!۔

کلرک۔ (انگلی ہلاتے ہوئے) اس دنیا میں کاٹھ کے الو نہیں بستے۔ کوئی اور جہاں تلاش کرو۔ اچھا صاحب۔ یہاں لیڈری نہیں چلے گی۔

پٹواری۔ کاٹھ کے الو نہیں۔ لوہے کے تو بستے ہیں یہاں۔ ایخ خ۔ خ۔ خ۔ کھوں۔

کھوں۔ کھوں (پٹواری کی روح ہلکا سا قہقہہ لگاتی ہے۔ اور اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتی ہوئی کھانستی ہے۔ اور موٹا سا بلغم لیڈر کی طرف پھینکتی ہے

تھانیدار۔ "اوئے کی گل ہے۔ تم کلا کلا ہنستا ہے۔ کوئی ہماری گل تو نہیں کر رہا؟"

تھانیدار کی روح پٹواری کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے۔ روحیں مل کر شور مچاتی ہیں۔ تھانیدار کی روح اچانک اپنے کفن پر مٹی لگی ہوئی دیکھ کر افسردہ ہو جاتی ہے اور ایک طرف چل دیتی ہے۔

اسے جاتے دیکھ کر چپڑاسی کی روح بھی اپنے کفن کو گھٹنوں سے اوپر اٹھائے پیچھے پیچھے چل دیتی ہے۔ دونوں روحیں چند قدم کے فاصلے پر ایک ٹوٹی قبر کے پاس بیٹھ جاتی ہیں۔

تھانیدار۔ ہا۔ ایک تو وہ ویلا تھا جب قبرستان وچ سوہنیاں سوہنیاں اور پکیاں قبراں بنتی تھیں۔ ہن دیکھو! صرف مٹی کے ڈھیر لبھتے ہیں۔ ہماری قسمت ——
(تھانیدار کی روح نگاہ اٹھا کر چاروں طرف پھیلی ہوئی قبروں کو دیکھتی ہے)
ہم کو ٹوٹے ملتے ہیں۔ پہلاں بڑے بڑے کاریگر ہوندے سن۔ مگر جب توں سائنس پیدا ہویا۔ کاریگراں نوں کوئی پچھدا ہی نہیں۔ ہائے اوئے ان غریبوں کا تو بھٹہ ہی بیہہ گیا۔

چپڑاسی۔ ہاں جی۔ ایک تو ہم بھٹہ میں بیٹھ گئے۔ ایک بچارا سائنس بھٹے میں بیٹھ گیا۔ کون تھا جی یہ سائنس؟ (چپڑاسی کی روح اس کے منہ کی طرف دیکھتی ہے۔

تھانیدار۔ اوئے جھلیا ہم بھٹے وچ نہیں بیٹھے

چپڑاسی ۔ تو جی یہ سائنس کون تھا؟ کس بھٹے میں بیٹھ گیا؟

تھانیدار ۔ اوئے پھندرا ۔ تم اس قسم کی گل کیوں آکھتا ہے ۔ جیہڑی ہم کو بھی معلوم نہیں ۔ (تھانیدار کی روح خاموش ہو جاتی ہے ۔ اور پھر کچھ سوچ کر چپڑاسی کی طرف دیکھتی ہے) تم پوچھ سکتا ہے کہ سائنس کیا ہے ۔ پچھ پچھ کی پچھنا ای ۔ اوئے بابا پچھ بھی ۔ آج ہم موڈ میں ہیں ۔ اس لئے ہم تم کو دس رہا ہے ۔

چپڑاسی ۔ میں سب کچھ سمجھ گیا ۔ لیکن واقعی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ سائنس کیا ہے

تھانیدار ۔ ایہی تے گل اے سمجھن والی ۔ کملیا تو بولدا ہے ۔ ہم سنتا ہے ۔ ہم بولدا ہے ۔ تم سنتا ہے ۔ ایہی سائنس ہے ۔

چپڑاسی ۔ اور وہ بول رہے ہیں اور ہم یہاں بیٹھے سن رہے ہیں (دوسری روحوں کی طرف اشارہ کرتا ہے) ۔

تھانیدار ۔ ہاں ۔ ایہہ بھی سائنس ہے ۔ جیہڑی گل تم کو سمجھ نہ آئے (چپڑاسی کی روح کو ہاتھ لگا کر) ساڈے جیسے افسراں سے پوچھو ۔ تم چپڑاسی اینہاں گلاں کو نہیں سمجھتا کہ سائنس کی ہوندا اے ۔"

چپڑاسی ۔ "اب تو میں سمجھ گیا ہوں"

تھانیدار ۔ "ہاں ہن توں تسی سمجھ گیا ہے ۔ چل اٹھ ۔ چلیئے ۔" (دونوں روحیں چل دیتی ہیں ۔ چند قدم چلنے کے بعد تھانیدار کی روح ٹھہر کر چپڑاسی سے مخاطب ہوتی ہے) ۔

تھانیدار ۔ دیکھ اوئے ہم نے تم کو سب کچھ دس دیا ہے ۔ تم کسی ہور کو نہ دسنا

اے کام دیاں گلاں ہیں۔" (دونوں روحیں دوسری روحوں کے ساتھ شامل
ہوجاتی ہیں اور شور مچاتی ہیں)
دکاندار۔ (دور سے کسی کو آتا دیکھ کر) "خاموش ہو جاؤ۔ عزرائیل آرہے ہیں
عزرائیل۔"
وکیل۔ "آرہے ہیں یا آرہا ہے۔ ہاہاہاہا۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ ہے ہے
ہے۔ ہے۔ (وکیل کی روح پاگلوں کی طرح ہنستی ہے) دکاندار دکاندار
ہی رہا۔ اس کا کام ازل سے ہی خوشامد کرنا ہے۔ کبھی سپاہی کی منتیں کرتا
ہے۔ اور کبھی انکم ٹیکس کے چپڑاسی کی ہو ہو ہو ہو۔"
چپڑاسی۔ (نچلا ہونٹ اپنے دانتوں میں دبا کر) "یہ بات نہیں۔ بلکہ اسے اب
بھی موت سے ڈر لگتا ہے"
کلرک "ماموں جان تو نہیں"
دکاندار "کس کی موت۔ کس کا ماموں؟ ہم یہاں آزاد ہیں۔ اور پھر عزرائیل جمع
کا صیغہ ہے۔"
وکیل۔ "جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ تو اور گرامر۔"
دکاندار "میں پڑھا ہوا نہیں تو کیا۔ سینکڑوں پڑھے ہوئے لوگوں سے کہیں اچھا
ہوں۔ اپنی عقل کے بل بوتے پر، میں دنیا میں ایک پیسے کا ایک روپیہ بناتا تھا
نقل کو اصل میں بدلنا اور گاہک کو پھنسانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔
گورنمنٹ کی گرفت سے بچنے کے لئے میرے پاس کئی کئی رجسٹر تھے۔ اور
اس کے علاوہ میں ماسٹر جی کے پڑوس میں رہتا تھا۔ جہاں رات دن وہ علم

اور جمع پر لے دے ہوا کرتی تھی۔

کلرک تب تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ کیوں جی؟ (کلرک کی روح پٹواری کی طرف دیکھتی ہے)

پٹواری۔ معاف کرنا۔ میں اس بارے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ میں صرف پٹواری ہوں۔ پٹواری نہر کا۔ زمین کی پڑتال کر سکتا ہوں۔ مہاجروں سے گھر کے چکر لگوا سکتا ہوں۔ یہی نہیں۔ بلکہ افسروں کو بھی چلا سکتا ہوں۔ (خاہ۔ اخاہ۔ خاہ)

کلرک۔ تم اپنے فن میں باکمال ہو۔ مجھ پر بھی سبقت لے گئے۔

(کلرک کی روح کے لیے لینے پر پٹواری کی روح فخر کے مارے اپنی گردن اکڑا کر وکیل کی طرف دیکھتی ہے)

وکیل۔ میں صرف ایل۔ ایل بی ہوں۔ زمین آسمان کے قلابے ملا سکتا ہوں۔ مجرم کو بے قصور اور معصوم کو قاتل ثابت کر سکتا ہوں۔ موکلوں سے پانی بھروا سکتا ہوں۔ منشی جی سے حقہ تازہ کروا سکتا ہوں۔ اور بس۔ ہو۔ ہو ہو ہو (زور سے اپنے پاؤں پر ہاتھ مارتی ہے۔ اور ڈاکٹر کی طرف اشارہ کرتی ہے)

وکیل۔ تم!

ڈاکٹر۔ میں

وکیل ہاں۔

ڈاکٹر۔ ای ہی ہی۔ کیا تم بھی نہیں جانتے؟ میں صرف ڈاکٹر ہوں۔ گو ایم بی بی ایس

نہیں۔ لیکن پھر بھی بغیر نبض دیکھے مرض کی تہ تک پہنچ جاتا ہوں۔ پوشیدہ بیماریوں کا علاج میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جریان ہو، سوزاک ہو، آتشک ہو، یا سستی، نامردی۔ پڑبال۔ موتیا۔ ککرے۔ دھند۔ جالا۔ پھولا۔ گنٹھیا فالج۔ دق۔ سل۔ بخار۔ کھانسی۔ ہیضہ۔ کمر میں درد۔ جوڑوں میں درد کچھ بھی ہو (وہ جلدی جلدی بیماریوں کا نام گنواتی ہے) یعنی کہ میں سب درد دور کر سکتا ہوں۔ استادالحکماء ہوں۔ افسرالاطباء ہوں۔ لیکن گرامر —— اس معاملے میں ذرا۔ صفر ہی ہوں (او ہو ہو ہو ہو۔ ای ہی ہی ہی ہی۔ —— آ ہا ہا۔ ہو ہو ہو ہو۔ روحیں قہقہے لگاتی ہیں۔ اور تھانیدار کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ تھانیدار چاروں طرف روحوں کو کھڑے ہوئے دیکھتا ہے)

تھانیدار۔ ہم تھانیدار ہے۔ تھانے دا مالک۔ کج نہیں جانتا۔ پر لتراں مار مار کے جمع دا واحد تے واحد دا جمع بنوا سکتا ہے۔ جے فیر بھی نہ منن۔ تو حوالات وچ سٹ سکتا ہے۔ کی سمجھا اى۔ اخ۔ خا۔ خا۔ خا۔

ایل ایم اے صاحب! تم بھی تے کج آکھو۔ (تھانیدار کی روح ایم ایل اے کے کاندھے پر زور سے ہاتھ مارتی ہے۔ اور وہ کاندھا پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے)

ایم ایل اے۔ (رونی ہوئی آواز میں) کیا کہوں؟ میرا تو بھرکس ہی نکال دیا۔ کاش کہ یہاں منسٹری ہوتی۔ پھر دیکھتا۔ اب تو میرے ہاتھ کٹے ہوئے ہیں۔ کسی ماسٹر سے مشورہ کیجیے۔

ارواح۔ نہیں ماسٹر (ماسٹر کا نام سن کر تمام روحیں چاروں طرف گھومتی ہیں اور ماسٹر جی ماسٹر جی پکارتی ہیں)

پٹواری - کہاں ہیں ماسٹر جی ؟ -
تھانیدار کتھے ہے ماسٹر
دکاندار کدھر ہے ماسٹر ؟ (ایک قبر پر چڑھ جاتی ہے)
تھانیدار اوئے بدتمیزا - ہیٹھاں اتر - ساڈھی قبراں دا نئے نم ہی بجو بن گیا - ہن پتہ لگا کہ یہ ٹوٹے ساڈوں کیوں پھتے ہیں ۔
ماسٹر جی - لڑو مت ! لڑو مت - ہوں - ہوں - ہوں - ادہر ہوں میں - بس ماسٹر (پتلی دبلی روح اپنی خمیدہ کمر کے ساتھ پرانے چشمے کو درست کرتی ہے اور آگے بڑھتی ہے)
کلرک - ذرا گرامر کی رو سے بتاؤ ! استاد - عزرائیل جمع ہے یا واحد (سب روحیں ماسٹر کے گرد گھیرا ڈال لیتی ہیں اور ماسٹر کی روح ان کے درمیان بیٹھ کر کچھ سوچنے لگتی ہے)
(روح - ماسٹر جی جلدی بھی کرو - ابھی بہت سی الجھی باتیں سلجھانی ہیں -
ماسٹر جی - بدتمیزو - پکڑو کان - ابھی پکڑو ! دماغ میں آئی ہوئی بات نکلوا دی ۔
پکڑو کان ! سب پکڑو ۔ (ماسٹر کی روح پھنکارتی ہوئی اٹھتی ہے)
تھانیدار (زور سے چلاتے ہوئے) "اوئے کان دیا پترا ۔ تم نے کمیٹی دا مدرسہ سمجھا ہے ۔ دسدا نہیں ۔ ایہہ تواڈاں دا قبرستان ہے ۔ زیادہ اوکھا ہویئں ۔ تو حوالات وچ بند کر دیانگا ۔" (اس پر سب روحیں قہقہہ لگاتی ہیں)
دکاندار ۔ خاموش بھی ہو جاؤ اب ۔ پہلے میری بات کا فیصلہ کرنے دو ۔ (دوکاندار کی روح چلاتی ہے ۔ اور ماسٹر کی روح پھر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگتی ہے)

ماسٹر جی - بھئی گرامر کی کتاب تو میرے مرنے سے پہلے ہی شریر بچوں نے چرا لی تھی۔ اور ملک الموت نے اتنی اجازت ہی نہیں دی کہ دوسری خرید لیتا مطالعہ کئے مدت گذر چکی ہے۔ لیکن جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے۔ عزرائیل نہ جمع ہے نہ واحد

ارواح - (حیرت سے) ہیں تو پھر کیا ہے؟

ماسٹر جی - نہ واحد جمع -

ارواح واحد جمع؟ کیا مطلب؟

ماسٹر جی ارے وہی عارضی مستقل -

ارواح اوہ - عارضی مستقل - الاٹمنٹ والا - ہا ہا ہا - ہی ہی ہی ہی اوہو ہو ہو ہو - (روحیں زور زور سے قہقہے لگاتی ہیں۔ قہقہوں سے تمام قبرستان گونجنے لگتا ہے) دور سے آتا ہوا شخص قریب آجاتا ہے۔ اس کی آواز سب کو سنائی دیتی ہے۔ عزرائیل کی بجائے وہ ایکٹر کی روح ہوتی ہے۔ جو جھومتی گاتی چلی آتی ہے۔

ایکٹر - اے میرے دل کہیں اور چل
غم کی دنیا سے دل بھر گیا
ڈھونڈ لے اب کوئی گھر نیا - اے میرے دل

کلرک - (دوکاندار سے) دیکھا یہ ہیں تمہارے عزرائیل - ہی ہی ہی ہی

ایکٹر - چل جہاں غم کے مارے نہ ہوں

(ایکٹر کی روح جھومتی ہوئی ان کے پاس سے گزرتی ہے۔ تھانیدار

اس کا کفن پکڑ لیتا ہے)

تھانیدار ۔ اوئے دل دیا ٹھیکیدارا ۔ ہن غم کی دنیا تیکہاں نستا ہے؟

کلرک ۔ غم کی دنیا ۔ واقعی یہ غم کی دنیا ہے ۔ کیونکہ یہاں کوئی ایکٹرس نہیں ۔ بچارہ غم زدہ ۔ ابھی ایکٹرس کا ۔ اسے ہے ہے ہے ہے

وکیل ۔ صاحب دوزخ ہی ایک ایسا ٹھکانہ ہے ۔ جہاں غم کے مارے نہیں ہوتے ۔ کیوں کیا ارادے ہیں؟

ایکٹر ۔ چل جہاں غم کے مارے نہ ہوں

(ایکٹر کی روح جھومتی ہوئی چل دیتی ہے اور تمام روحیں پاگل پاگل پکارتی ہیں اور زور زور سے ہنستی ہیں

ارواح ۔ پاگل ۔ پاگل ۔

مجسٹریٹ ۔ آرڈر ۔ آرڈر (مجسٹریٹ کی روح چلاتی ہے ۔ لیکن روحیں خاموش نہیں ہوتیں ۔ اس پر وکیل کی روح چیختی ہے)

وکیل ۔ جناب والا ۔ نکال دیجئے ایسے شخصوں کو عدالت سے

مجسٹریٹ ۔ (چپڑاسی کی روح سے) ہاں چپڑاسی نکال دو انہیں!

چپڑاسی ۔ معاف کرنا ۔ چپڑاسی کی ہیٹی ویں عدالت میں بھول آیا ہوں

(یہ سن کر تمام روحیں قہقہے لگاتی ہیں ۔ مجسٹریٹ کی روح آرڈر آرڈر چلاتی ہے ۔ اور پھر خود بھی زور زور سے ہنستی ہے اور کہتی ہے)

مجسٹریٹ ۔ میں تو بھول ہی گیا تھا ۔ کہ ہم سب آزاد ہیں ۔ ای ہی ہی ہی ہی ۔ ذرا ٹھاکر دیکھیں وہ کون ہے ۔ ای ہی ہی ہی (ایک طرف اشارہ کرتی ہے)

پٹواری — اخاہ - یہ تو فلاسفر ہے - ایک دفعہ میرے پاس زمین کے لئے آیا تھا۔ لیکن میں نے ٹرخا دیا - ہاہاہا - حلیہ تو دیکھو ! گویا کباڑی کی دکان سے اٹھ کر چلا آرہا ہے - ہو ہو ہو ہو (روحیں ہنستی ہیں - اور اس کے گرد گھیرا ڈال بیٹھتی ہیں)

ارواح — ارے یہ تو بولتا ہی نہیں - ڈاکٹر صاحب ذرا نبض دیکھ کر مرض معلوم کریں

ڈاکٹر — ہوں ہوں، کیوں نہیں (ڈاکٹر فلاسفر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے) ہیں! اس کی تو نبض ہی غائب ہے - (ارواح کی طرف دیکھتے ہوئے) لائیے میری دواؤں کی صندوقچی دیجئے

ارواح — صندوقچی ؟ (وہ سب ادھر اُدھر دیکھتی ہیں مگر صندوقچی نہیں ملتی)

ڈاکٹر — ہوں یاد آیا - کم بخت کمپاونڈر نے میرے ساتھ نمک حرامی کی ہے - نمک حرام ! میرے نمک کا بھی لحاظ نہیں کیا - میرے ملک میں نمک بہت ہی سستا تھا - خبیث - کم سے کم گھٹیا قسم کا نمک ہی حلال کر دیتا - الّو - پاجی - گدھا - بیوقوف - میری صندوقچی رکھ کر خود ہی ڈاکٹر بن گیا - حالانکہ میں اس شرط پر عزرائیل کے ساتھ آیا تھا - کہ وہ میری صندوقچی بھی ساتھ لائے گا - اور لو ! اسٹیتھسکوپ بھی گلے سے اتار لیا - (گلے کو ہاتھ لگا کر) بہت ہی پاجی نکلا وہ - خیر آنے دو یہاں سمجھ لوں گا - سمجھ لوں گا -

(تمام روحیں کھکھلا کر ہنستی ہیں اور ڈاکٹر کی طرف دیکھتی ہیں)

ارواح — ڈاکٹر صاحب ! طبیعت تو ٹھیک ہے - ؟

ماسٹر جی - یہاں سب آزاد ہیں ڈاکٹر صاحب - سماوی دنیا میں (سمجھ لوں گا) کوئی اہمیت نہیں رکھتا - سمجھے اخاہ - خاہ - خاہ

(روحوں کو پھر ہنسی آتی ہے - ڈاکٹر کی روح سر پکڑ کر فلاسفر کے سہارے بیٹھ جاتی ہے - تھوڑی دیر بعد فلاسفر کی روح یکلخت کھڑی ہو جاتی ہے اور مٹی میں اٹے ہوئے بالوں کے ساتھ گڑگڑاتی ہے)

فلاسفر جینے دو - خدا کے لئے جینے دو !! مجھے یہاں دق نہ کرو - کچھ سوچنے دو - سوچنے دو - جینے دو - کرنے دو -

ارواح - شکر ہے - شکر ہے - زندہ ہے - بولتا ہے -

کلرک ای ہی ہی ہی، ایخ خی خی خی - میری نظر میں تم سب بے وقوف ہو - اوہو ہو ہو - جانتے نہیں ؟ یہ باغ گورستان ہے - روحوں کی نکہت گاہ - آہا ہا ہا - (کلرک کی روح زور زور سے ہنستی ہے اور سب روحیں اس کے منہ کی طرف دیکھتی ہیں - وہ اپنی انگلی ہلاتی ہے) یہ باغ جہاں نہیں - جہاں زندگی اکڑ اکڑ کر چلتی ہے - اور نہ یہ روضۂ رضواں ہے - جہاں لال - گلابی، اودے، پیلے پھولوں کی خوشبو کے سائے میں حوریں بیٹھی شہیدوں کو کہانیاں سنایا کرتی ہیں - ان کے دل بہلایا کرتی ہیں - ایخ خی خی خی - سمجھے یہ تو چمنِ قبرستان ہے جہاں دھول اڑتی ہے - سمجھے نوجوانوں کے خوبصورت جسموں کو یہاں کی خاک کھا جاتی ہے - اور دولت مندوں کے غرور کو دیمک چٹ کر جاتی ہے - حسینانِ ارض لمحہ بھر یہاں ٹھہر نہیں سکتیں

اس جگہ حیات کا گزر نہیں۔ یہاں ممات کے جھونکے بے اثر ہیں۔ مرتے وقت میں نے فائلیں دیکھی تھیں۔ ان فائلوں میں حیات و ممات کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ جس وقت میں یہاں آیا۔ اس وقت بھی فائلیں میرے سرہانے رکھی تھیں۔ ہا ہا ہا۔

لیڈر فائلیں۔

کلرک جی میں اہلکار رہوں۔

دکاندار اہلکار؟

کلرک جی ہاں اہلکار یعنی کلرک عرفِ عام میں منشی جی۔ چونگی کا نہیں۔۔ ڈی سی کا۔ ڈپٹی کمشنر کا۔ جو کہ ضلع بھر کا مالک ہے۔ سمجھے۔۔ ہا ہا ہا ہا۔ اس لائف سے یہ زندگی کتنی پرسکون ہے۔ روٹی کا یہاں فکر نہیں۔ میلے کچیلے بچے تنگ نہیں کرتے۔ مسلوں سے یہ آزاد زندگی۔ ای ہی ہی ہی۔ (کلرک کی روح قہقہے لگاتی ہے۔ اور پھر فلاسفر سے کہتی ہے) "یار۔ ایک بیڑی ہے"

فلاسفر بیڑی۔ کیوں جیل جانے کا ارادہ ہے۔ رشوت ستانی میں۔ "انہ کیہڑا ہے؟"

کہاں؟ (سب روحیں تھانیدار کے اشارہ کرنے پر ایک طرف دیکھتی ہیں)۔

تھانیدار۔ او۔ درخت کے ہیٹھاں۔ نچے

ارواح درخت کے نیچے؟

وکیل اَرے ہاں نئی قبر کے پاس کوئی بیٹھا ہے۔ آؤ چلیں! (وکیل کی روح کے پیچھے پیچھے تمام روحیں چل دیتی ہیں) ایک نوجوان جس کے چہرہ پر حد درجہ معصومیت چھائی ہوئی ہے۔ اور سر پر لہو میں بھیگی پٹی بندھی ہے۔ کفن پر تازہ تازہ خون کے دھبّے پڑے ہوئے ہیں۔ قبرِ نو سے پیٹھ لگائے کسی سوچ میں بیٹھا ہے۔ چاندنی عمر رسیدہ درخت کے پتوں میں سے چھن چھن کر اس کے چہرہ پر پڑ رہی ہے۔ روحیں اسے دیکھ کر بڑی متاثر ہوتی ہیں۔ اور چپ چاپ اس کے گرد گھیرا ڈال لیتی ہیں۔ نوجوان سر جھکائے بیٹھا ہے۔

ماسٹر جی بیٹا تم کون ہو؟

وکیل کل تو یہاں نہیں تھے؟

چپڑاسی آج ہی آئے ہو کیا؟

مجسٹریٹ بھائی بولتے کیوں نہیں؟

کلرک ارے کچھ تو بولو۔

ایم ایل اے ہم سے ناراض ہو کیا؟

ڈاکٹر تمہارے سر پر پٹی کیوں بندھی ہے؟

تھانیدار کس نے تمہیں مارا ہے؟

پٹواری ہاں ہاں بتلا تو سہی

فلاسفر اے شہید کچھ تو بولو؟

لیڈر مجھ سے نہ چھپاؤ

دکاندار گنہ گاروں سے نہیں بولنا چاہتے ؟

(روحیں باری باری نوجوان سے سوال کرتی ہیں۔ مگر نوجوان خاموش رہتا ہے۔ آخر ماسٹر جی کی روح آگے بڑھ کر نوجوان کے پاس بیٹھ جاتی ہے اور اس کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی ہے۔ نوجوان اپنا سر اٹھاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں۔

ماسٹر جی۔ بیٹا روتے کیوں ہو؟ بتلاؤ تو سہی کس ظالم نے تمہاری ننھی سی جان پر ظلم کیا ہے۔

ہاں ہاں بھائی بولو ہم اسے کھا جائیں گے۔

ہم تباہ کر دیں گے۔

ساڑ دیاں گا

مسل دیں گے

خاک میں ملا دیں گے

اس کا کفن تار تار کر دیں گے

فرش خاک پر بھی چین نہ لینے دیں گے

اٹھا کر کتوں کے آگے پھینک دیں گے۔

ہڈیوں کا سرمہ بنا دیں گے

بولو تو سہی

بتلا تو دو

سب روحیں نوجوان کے پاس بیٹھ جاتی ہیں۔ نوجوان نگاہ اٹھا کر باری

بار ہی سب کی طرف دیکھتا ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ کچھ کہتا ہے۔

نوجوان۔ ایک ہو تو کہوں۔ سب نے ہی مل کر ستم ڈھائے ہیں۔

ارواح۔ ستم؟۔ اس ننھی سی جان پر (روحیں ایک دوسرے کے منہ کو دیکھتی ہیں)

خدا کا قہر نازل نہیں ہوا؟

ستارے ٹوٹ کر نہیں گرے؟

چاند کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوئے؟

سورج کا چہرہ کالا نہیں پڑا؟

اسرافیل چپ ہی رہا؟

دیوتاؤں کے کلیجے شق نہیں ہوئے؟

انہوں نے پربت کاٹ کر ساگر نہیں بنا دئے؟

زمین کی چھاتی نہیں ہلی؟

گلوب کی حرکت تو بند نہیں ہوئی؟

کوئی زلزلہ تو نہیں آیا؟

طوفان تے آیا ہوگا؟

آگ نہیں بھڑکی؟

نوجوان۔ طوفان! ہاں طوفان ضرور آیا تھا۔ آگ بھی لگی تھی۔

ارواح۔ طوفان۔ آگ (تمام روحیں نوجوان کی طرف دیکھتی ہیں۔ ان کے منہ کھلے ہوئے ہوتے ہیں)

نوجوان۔ اس طوفاں نے میری روح تک کو لرزا دیا ہے۔ یہ آگ اب بھی میری

ماں کے کلیجے کو جلا رہی ہے۔ میری ماں طوفان میں گھری ہے۔ چاروں طرف پانی ہی پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اور بیچ میں میری ماں کھڑی پھنک رہی ہے۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ پر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میری ماں کے جسم پر جب ذرا سی خراش آجاتی تھی۔ تو میری روح تڑپ اٹھتی تھی۔ لیکن آج وہی ماں انگاروں پر لوٹ رہی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کتنی بے بسی ہے۔ ہا۔ بغایت مجبوری — میری بیوہ ماں'

(نوجوان اتنا کہنے کے بعد خاموش ہو جاتا ہے)

فلاسفر۔ 'بیوہ ماں' — ہاں ہاں آگے کہو۔ رک کیوں گئے؟

(فلاسفر کی روح بیچ میں بول اٹھتی ہے۔ تمام روحیں اس کی طرف آنکھیں نکالتی ہیں اور وہ چپ ہو جاتا ہے)

نوجوان۔ میری بوڑھی ماں جس نے مجھے پال پوس کر جوان کیا تھا۔ آج میری جوانی کو یاد کر کر کے رو رہی ہے۔ جس ماں نے میری ہر خواہش کو پورا کیا۔ آج میری جدائی میں وہ خون کے آنسو بہا رہی ہے۔ مجھ سے یہ دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ گھڑی گھڑی بھائی بہن مجھے یاد آتے ہیں۔ کون جانے؟ میں انہیں یاد آتا بھی ہوں گا یا نہیں۔ دنیا، دنیا ہے۔

میرے کفن کا تار تار تھوڑی دیر بعد گرم ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ میری بوڑھی بیوہ ماں کا کلیجہ شق ہوا جا رہا ہے۔ اور اس کی گرم گرم آہوں کی حرارت مجھ تک پہنچ رہی ہے۔ میرا کفن اسی لئے بار بار سلگ اٹھتا ہے۔

ہیں سے ظالموں کی دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔ کتنوں کے کلیجے ٹھنڈے ہو گئے اور کتنے کلیجوں میں نہ ختم ہونے والی آگ بھڑک اٹھی۔ کتنوں نے قبائے سلطانی زیب تن کر لی ہے۔ اور کتنے ہی خلقان درویشی کو اپنا بیٹھے ہیں۔ کتنا تفاوت ہے۔

(نوجوان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک اس کے کفن پر گرتے ہیں۔ اور جگہ جگہ آنسوؤں کے نشان ابھر آتے ہیں۔ وہ اپنے کفن کی لمبی لمبی بانہوں سے اپنے آنسو خشک کرتا ہے۔ اور پھر باری باری سب روحوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے)

نوجوان۔ مجھے چند لمحوں کے لئے اپنی ماں کے پاس چلے جانے دو۔ صرف چند منٹ کے لئے۔ میں اپنی ماں کو صرف ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ بولو۔ بولتے کیوں نہیں۔ ہائے ظالموں نے مجھے میری ماں سے جدا کر دیا (سب روحوں کے سر جھک جاتے ہیں اور ماسٹر کی روح نوجوان کے کندھے کو چھوتی ہے)

ماسٹر جی۔ بیٹا ہم مجبور ہیں۔ ورنہ عزرائیل کی قسم! ہم سب تمہاری مدد کرتے اور تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری عمر رسیدہ ماں کے پاس جانے کی اجازت دے دیتے۔ واقعی تم پر بہت ظلم ہوا ہے۔

ماں! واقعی ایک نعمت ہے۔ اس کا کلیجہ موم کا کلیجہ ہوتا ہے۔ ذرا سی ٹھیس اس کلیجے کو پھونک کے رکھ دیتی ہے۔

(نوجوان خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا ہے۔ اور سر جھکا لیتا ہے۔

روحیں نوجوان کو ہنسانے کی بار بار کوشش کرتی ہیں۔ اچھل اچھل کر عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہیں۔ لیکن نوجوان کے غمگین چہرہ پر مسکراہٹ تک بھی نہیں آتی۔ وہ خاموش رہتا ہے۔ اور بیٹھے بیٹھے اس کے منہ سے آہ نکلتی ہے۔ آہ۔ ایک شہید کی آہ۔ (سب روحیں چلاتی ہیں)

ارواح۔ بھاگ چلو۔ یہاں سے یہ شہید ہے۔ چلے چلو۔ ورنہ سب کے کفن آہ سے جل اٹھیں گے۔ اور ہم ننگے ہوجائیں گے۔ ننگے۔ بالکل برہنہ

(روحیں نوجوان کو وہیں پر چھوڑ کر اسی جگہ واپس چلی آتی ہیں اور چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہوجاتی ہیں۔ وہ اچھلتی ہیں۔ کودتی ہیں۔ شور مچاتی ہیں)

وکیل۔ فلاسفر! فلاسفر!! (فلاسفر کی روح کو ہاتھ لگاتے ہوئے)

فلاسفر۔ ہوں

وکیل۔ بال بہت بڑھ گئے ہیں۔

فلاسفر۔ ہوں

وکیل۔ انہیں صاف کرادو۔

فلاسفر۔ صاف کرادوں۔ مگر کیوں کرادوں

وکیل۔ بُرے لگتے ہیں۔ لاء کے خلاف ہیں۔

فلاسفر۔ بُرے لگتے ہیں۔ لاء کے خلاف ہیں۔ تو پھر حجام کہاں ہے؟ حجام کہاں ہے۔

پٹواری۔ وہ تو ابھی یہاں پہنچا ہی نہیں۔ مجھے بھی انتظار ہے۔ دیکھئے داڑھی کتنی بڑھ گئی ہے۔ (اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتی ہے)

ڈاکٹر ۔ پٹواری صاحب! حجام کو یہاں سامان کون لانے دے گا ۔ سوچنے کی بات ہے ۔

پٹواری ۔ ارے تم نہیں جانتے ۔ ! حجام یار بڑے ہی چالاک ہوتے ہیں ۔ فرشتوں تک کی حجامت کر دیتے ہیں ۔ ایک آدھ استرا چھپا کر لے ہی آئیں گے ۔

وکیل ۔ آہستہ آہستہ ۔ کہیں فرشتے نہ سن لیں ۔

مجسٹریٹ :۔ ہاں ۔ اگر فرشتوں نے سن لیا ۔ تو گرز مار مار کر حجام کی پسلیوں کا سرمہ بنا دیں گے ۔ لا ر لا ہے ۔

پٹواری ۔ اور ہماری داڑھیاں قیامت تک صاف نہ ہو سکیں گی ۔ (پٹواری کی روح منہ بناتے ہوئے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتی ہے)

ماسٹر جی ۔ یاد آیا پٹواری صاحب ۔ ذرا یہ تو بتاؤ ۔ حجام کو مرنے کے بعد کچھ جگہ بھی مل جائے گی ۔ یا وہ جگہ الاٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے تک پہنچ ہی نہیں سکے گا ۔

پٹواری ۔ ٹیڑھا سوال ہے ۔ کچھ کہہ نہیں سکتا ۔ تمام رجسٹر بمع فرد انت وہیں پہ رہ گئے ۔ میرا پٹوار کا بستہ بھی اسی جگہ رہ گیا ۔ مہاجروں نے میرے مرتے ہی ان پر بھی قبضہ کر لیا ۔ حالانکہ ہزارہا بیگہ زمین میرے قبضے میں تھی ۔ اور اسی طرح میرے دوسرے بھائی جی عیش اڑا رہے تھے ۔ خبر نہیں ۔ اس میں سے حجام کو کچھ جگہ ملیگی بھی یا نہیں ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ہمیں یہاں حجام کی ضرورت پڑے گی ۔ تو میں مرنے سے پہلے کچھ زمین اسے دے آتا بغیر رقم کا مطالبہ کئے بخش دیتا ۔

فلاسفر ارے تم مر گئے کیسے ؟ (تمام روحیں فلاسفر کی طرف دیکھتی ہیں ۔
لیڈر کی روح آگے بڑھتی ہے) ۔
لیڈر تعجب ہے ۔ واقعی ان کی موت پر ۔ کیا آپ نے سنا نہیں ؟
ارواح ۔ (ایک ساتھ) کیا ؟
لیڈر یہی کہ زمین پر پڑا ری آسمان پر بار ی ۔ ایک ہی درجہ رکھتے ہیں ۔
فلاسفر (آہستہ آہستہ ہنستا ہے) کیا تھیوری بیان کی ہے ۔ استاد مان گئے
ارواح تھیوری ۔ ہا ہا ہا ۔ ای ہی ہی ہی ۔ اے ہے ہے ہے
ایخ خی خی خی (تمام کی روحیں اور زور زور سے ہنستی ہیں)
لیڈر چپ کرو ۔ چپ رہو ۔ کوئی سنتا ہی نہیں (لیڈر کی روح پہلے بڑبڑاتی ہے ۔ اور پھر زور سے چیختی ہے) ارے میں ہوں تمہارا
لیڈر ۔ محبوب راہنما ۔ بھول گئے اتنی جلدی ۔ احسان فراموش
۔ تھانیدار! ان سب کو بھگاؤ ! ۔ تھانے دار ۔!!
تھانیدار ۔ گرم ہونے کی لوڑ نہیں ۔ اسی لاچار ہیں ۔
فلاسفر (جلدی سے بولتے ہوئے) اچار ہیں ۔
(اس پر روحیں پھر قہقہہ مارتی ہیں اور ہاتھ بجا بجا کر ناچتی ہیں)
تھانیدار ۔ اوئے فلاسفرا ۔ ایہہ فلاسفی بیان کرن دا ویلا نہیں ۔ سوچ سمجھ کے گل آکھیا کرو ! ۔
لیڈر ۔ تھانیدار ! ۔

تھانے دار ۔ ویکھدے نئیں ۔ ہمارے کول نہ پیٹی نہ پستول ۔ گورنمنٹ ۔
اُف ۔ ساڈے کارناموں کا کچھ بھی خیال نہیں کیتا ۔ مرنے ویلے
ہماری پیٹی وی لاہ لئی ۔ ۔ اوئے ربا ۔ جے اج ساڈے کول پیٹی
ہوتی ۔ تو ہم بھی قبرستان کا ایس ایچ او ہوتا ۔ او لیڈر فیر ویکھدا
ساڈا رباب

ارواح ۔ او ہو ہو ہو ۔ یہاں کوئی تھانیدار نہیں ۔ کوئی مجرم نہیں ۔
ای ہی ہی ہی ہی

کلرک ۔ (تھانیدار کی روح سے) تھانیدار نہ سہی ۔ خبردار تو ہو ۔ او ہا ہا ہا
تھانیدار ۔ چلو جھگڑا ہی مکا ۔ میں تھانیدار نہیں ۔ تو ایتھے کوئی پولیس
کپتان بھی نہیں ۔
ہا ہا ہا ۔ ای ہی ہی ہی ہی ۔ اے ہے ہے ہے ہے
ایخ خی خی خی ۔ اخ خاہ ۔ خاہ ۔ خاہ ۔ او ہو ہو ہو ۔
ہے ہے ہے ہا ہا ۔ ہا ہا ۔ ہو ہو ۔ ہا ہا ۔

(تھانیدار کی روح کے ساتھ ساتھ دوسری روحیں بھی زور زور سے قہقہے لگاتی ہیں ۔ اچھلتی ہیں ۔ کودتی ہیں ۔ اور شور مچا مچا کر قبرستان سر پر اٹھا لیتی ہیں ۔ فرشتے ہاتھوں میں کوڑے لئے ہوئے نمودار ہوتے ہیں ۔ اور دھڑا دھڑ ان پر برسانے لگتے ہیں ۔ روحیں چیختی ہوئی ادھر ادھر بھاگتی ہیں ۔ اور پھر اپنی اپنی قبر میں گھس جاتی ہیں ۔ دو فرشتے دوڑ کر نوجوان کے پاس

پہنچتے ہیں۔ اور اسے اپنے کاندھے پر بٹھلا کر آسمان کی طرف اڑ جاتے ہیں۔ چاروں طرف سنّاٹا چھا جاتا ہے۔ اندر چاند مغربی کونے میں سسکیاں بھرتا ہے۔ دور سے ایکٹر کی روح کی آواز سنائی دیتی ہے۔

لٹ رہا تھا کسی کا جہاں
دیکھتی رہ گئی یہ زمیں

کانگو کے کنارے

ستاروں کا غبار چھٹنے لگا۔ سپیدۂ سحر مشرقی کناروں سے پھوٹا۔ تاریکی ہٹ کر مغرب کی جانب سمٹنے لگی۔ ہلکی ہلکی روشنی دریائے کانگو کے جنگلات سے ڈھکے ہوئے پہلوؤں پر پھیل گئی۔

دریائے کانگو کے دونوں طرف تاریک جنگلات پھیلے ہوئے تھے۔ کانگو کے دائیں کنارے لبِ دریا سے تقریباً سو گز ہٹ کر سیاہ فام نیگروں کی کچھ جھونپڑیاں درختوں سے گھرے ہوئے تنگ سے میدان میں کھڑی تھیں۔ جھونپڑیوں کے درمیان چند ناریل کے دیو قامت درخت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے عرصۂ دراز سے ان جنگلیوں کی پاسبانی کر رہے تھے۔ ہر جھونپڑی کے درمیان ایک لمبا بانس کھڑا تھا جس کے چاروں طرف دائرہ کی شکل میں گھاس اور نرسل لگا کر جھونپڑی کی شکل دے دی گئی تھی۔ ان جھونپڑیوں میں نہ کوئی کھڑکی تھی، اور نہ ہی روشندان

صرف ایک تنگ سا راستہ بنا ہوا تھا جس کے ذریعے رینگ کر نیگرو جھونپڑی کے اندر گھسنے اور باہر آتے تھے ۔ جھونپڑیوں کے اندر نرم نرم گھاس پر شیر اور چیتے کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں ۔ کھانا پکانا جھونپڑیوں سے باہر ہی ہوتا تھا ۔ رات کو بستی میں جگہ جگہ لکڑیوں کے الاؤ جلا دئے جاتے تھے ۔ جو دن کی روشنی پھیلنے تک ابھاگن کے جیون کی طرح سلگتے رہتے تھے ۔ نیم برہنہ جنگلی اپنی دنیا میں مست تھے ۔

میلوں پھیلے ہوئے جنگلات میں شیر رات دن اپنے اپنے کچھاروں سے نکل کر دھاڑتے اور تمام دن ہاتھیوں کے غول درختوں کو گراتے ہوئے چنگھاڑ چنگھاڑ کر جنگل کو روندا کرتے تھے ۔ قدم قدم پر خوفناک اژدہے پڑے ہوئے پھنکارتے تھے ۔ جس وقت بندروں اور لنگوروں کی متفرق ٹولیاں درختوں کی شاخوں پر اودھم مچایا کرتی تھیں ۔ کانگو کے کنارے گھڑیال اور مگرمچھ پاؤں پھیلائے دھوپ میں پڑے رہتے تھے ۔ ربڑ اور ناریل کے درختوں کی یہاں بہتات تھی ۔

کانگو کے کنارے کنارے سیلے کیلوں کے درخت لمبے تڑنگے ہٹیلے نوجوانوں کی مانند آگے پیچھے صفیں باندھے کھڑے تھے ۔ کیلوں کے درمیان کہیں کہیں بید مجنوں کی شاخیں لٹک کر اس طرح پانی میں گھس گئی تھیں ۔ جیسے شرمیلی کنواریاں اپنی حنائی انگلیوں کے پوروں کو شفاف پانی میں ڈالے جھکی جھکی نگاہوں سے اپنے اپنے محبوب کو دیکھ رہی ہوں ۔

گاہے گاہے تند ہواؤں کے جھکڑ چلتے اور ناریل کے درخت جھپٹ جھپٹ کر ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگ جاتے ۔ بارہا ملگجے اور سیاہ رنگ کے بادلوں کے سینکڑوں دوپٹے اڑاتی ہوئی ہوا آتی ۔ اور راں سے جنگلات کو اس طرح

ڈھانپ دیتا۔ جیسے کوئی منہ پھٹ مسافر گاؤں کی باڑھ پہ کھڑی ہوئی الہڑ دیہاتن
کو دیکھ کر بے ساختہ کہہ رہا ہو۔ ع

کھینچ کر آنچل ذرا سینے کو اپنے ڈھانپ لے
راز تیری نوجوانی کا نہ کوئی بھانپ لے

قزح فرشتہ سینکڑوں ملائک کو لے کر گھٹاؤں کی کالی دوشیزہ پہ دھڑا دھڑ بجلی کے کوڑے برساتا تھا۔ شیر۔ ہاتھی، اژدہے اور بندر سب مل کر جنگلات کو سر پہ اٹھا لیتے۔ اور موسلا دھار بارش درختوں کو اوپر سے نیچے تک ایک نیا لباس پہنا دیتی تھی۔ ایسے میں گھڑیال اور مگر مچھ کود کود پانی میں گھس جاتے تھے۔ چاروں طرف جل کے تھل لگ جاتے اور رنگا رنگ کی خوشنما دھنک جنگلات کے اس سرے سے اس سرے تک اس طرح پھیل جاتی۔ جیسے ہلال اٹھا ہو کر جنگلات کی دیوی کا منہ چوم رہا ہو
دو تین بندر دوڑ کر ناریل کے درختوں پہ چڑھ گئے۔ جنگلی بچے شور مچا مچا کر پتھر مارنے لگے کالی کالی نیم برہنہ عورتیں جو اپنی بھرپور جوانیوں کو پھٹے چیتھڑوں میں چھپائے مست ہرنیوں کی طرح جھونپڑیوں کے درمیان ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔ بندروں کو کھر کھر کرتے ہوئے دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

"کیا بن رہا ہے سومی؟" نوجوان بیگرو نے بھالے کو اپنے ہاتھ میں جھولاتے ہوئے پوچھا۔ اور پھر خود ہی بولا۔

"کیلے کھانے کو جی چاہ رہا ہے؟"

سومی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور لٹکتی ہوئی پھلیوں کی طرف اچھلی۔

"اوں ہوں۔ یوں نہیں۔ ایسے" نوجوان نے اپنے بھالے سے کیلے کی پھلیوں

کو ہلا دیا۔ پکی پکی پھلیاں زمین پر آگریں۔ سومی پھلیاں اٹھانے کے لیے جھکی اور پھر کچھ سوچ کر ٹھہر گئی۔

"میں مری ہوئی تو نہیں جو دوسروں کی گرائی ہوئی پھلیاں اٹھا کر کھاؤں۔"

"مرا ہوا تو میں ہوں۔" نوجوان نے پھلی چھیل کر پیش کی۔ سومی نے لپک کر منہ مارا۔ اور آدھی پھلی کھا گئی۔

"اچھی نہیں پھیکی ہے۔" سومی نے منہ بنا کر کہا۔ نوجوان نے دوسرا کیلا اٹھا کر چھیلا

"یہ بھی خراب ہے۔" سومی مزے لے لے کر پھلیاں کھا رہی تھی۔ اور نوجوان نیگرو چھیل چھیل کر پیش کر رہا تھا

"ساتو!"

"ہاں" نوجوان نے چھلکے کو پھینک کر سومی کی طرف دیکھا۔

"تو مجھے گھور کیوں رہا ہے۔ کھانے کا ارادہ ہے؟" سومی بولی اور مسکراتی ہوئی جانے کے لئے مڑی۔ زمین پر پڑے ہوئے چھلکے پر اس کا پاؤں پڑا اور وہ گری ساتو نے بغل میں دبایا۔ ہوا اچھالا زمین پر گرا دیا اور لپک کر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

"تو بہت خراب ہے۔"

"سومی۔"

"خبر نہیں کس نیت سے پھلیاں کھلائی تھیں۔" سومی کھڑے ہو کر بولی۔ اس نے ساتو کی چوڑی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر اسے تھوڑا سا پیچھے دھکیل دیا۔ اور منہ پھیر کر مسکراتی ہوئی بستی کی طرف چل دی۔ کانگو کا پانی دھیرے دھیرے رواں تھا۔

چھوٹی چھوٹی چڑیوں نے پاسباں کو نوید صبح دی۔ سورج درختوں کی آڑ سے نکلا۔ کانگو کے چلتے ہوئے پانی کا پھلتا ہوا عکس کیلے کے بڑے بڑے پتوں پر پڑا اور روپہلی کرنیں اشجار کی فلک رس چوٹیوں پر آ کر رقص کرنے لگیں۔ ہلکا ہلکا غبار اٹھا۔ اور نیگرو اپنی گنبد نما جھونپڑیوں سے نکل نکل کر جنگل میں بکھر گئے۔

ساتو رینگ کر اپنی جھونپڑی سے نکلا اور بھالا ہاتھ میں لئے ہوئے کانگو کی طرف چل دیا۔ دریا کے کنارے کیلوں کے جھنڈ جگہ جگہ کھڑے ہوئے تھے۔ ان جھنڈوں کے درمیان جنگلیوں نے کہیں کہیں نہانے کے لئے جگہ بنائی ہوئی تھیں۔ ساتو بھالا زمین پر ڈال کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ ہوا فضا کی گود میں سرسرائی اور کیلے کے پتے جھومنے لگے۔

ساتو منہ ہاتھ دھو کر کھڑا ہی ہوا تھا۔ کہ اس نے کیلے کے جھنڈ کی دوسری طرف چیخ کی آواز سنی۔ ساتو جلدی سے بھالا اٹھا کر بھاگا۔ دریا سے چند قدم کے فاصلے پر سومی سہمی ہوئی کھڑی تھی اور ایک گھڑیال زمین پر پڑا منہ کھولے سومی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ساتو نے گھڑیال کو بھالے سے الٹ کر پے در پے وار کئے۔ اور چند ہی منٹ میں اسے پھاڑ کر رکھ دیا۔ سومی دوڑ کر ساتو سے چمٹ گئی۔ اس کا نرم و گداز سینہ پھٹا جا رہا تھا۔

"دیوی نے بچا لیا" سومی ساتو سے الگ ہٹ کر اپنی پیشانی پر پڑی ہوئی بالوں کی لٹ ہٹانے لگی۔

"اس طرح اکیلے نہیں آنا چاہیئے۔ اگر کچھ ہو جاتا تو۔۔۔۔"

"ہو کیسے جاتا۔ میری بستی کے نوجوانوں کی رگوں میں خون ہے۔ کنگوا کا پانی

نہیں۔" سومی نے ان آنکھوں سے دیکھا جن میں سیاہ گھٹائیں عرصہ دراز سے سماتی چلی آتی تھیں
"میں نکل آیا۔ ورنہ پتہ نہیں کیا بنتا۔" یہ کہہ کر سانو اپنا بھالا کیلے کے درخت سے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگا۔ مرا ہوا گھڑیال قریب ہی پڑا تھا۔
"سومی" سانو نے بھالے کی انی صاف کر کے سومی کو اپنی باہوں میں لینا چاہا۔ مگر وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔
"وقت سے پہلے نہیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو شامت آجائے گی۔"
"میں کسی سے نہیں ڈرتا سومی۔ مجھے ڈرانے کی ضرورت نہیں۔ تم میرے بھالے کی دھار اچھی طرح دیکھ چکی ہو۔ میں ہر مصیبت سے ٹکرانے کو تیار ہوں۔"
"میں جانتی ہوں تو بڑا بلوان ہے۔"
"جب معلوم ہے۔ تو پھر بچوں والی باتیں کیوں کرتی ہو؟" سانو نے بھالا ایک طرف پھینک کر سومی کو اپنی کلائیوں میں جکڑ لیا۔ اور اس کی سانولی سلونی پیشانی چوم لی۔ سومی اس کی باہوں میں کسمسائی۔ سانو نے گرفت ڈھیلی چھوڑ دی۔ اور وہ اچھلتی کودتی ایک طرف دوڑ گئی۔ سانو نے زمین پر پڑا ہوا بھالا اٹھا لیا۔
چودہویں رات کا چاند گوری چٹی دلہن کے ماتھے پر پڑے ہوئے جھومر کی طرح چمک رہا تھا۔ نتھری ہوئی چاندنی درختوں کی شاخوں پر جھول رہی تھی۔ اور اجلی اجلی کرنیں مل کر بستی کے کونے کونے میں ایک حسین سی چادر بچھا رہی تھیں۔ ہر چودہویں کا چاند جب پورا ہوتا تو نیگرو ذکور واناث برہنہ ہو کر ناچتے تھے۔
چودہویں کا چاند چڑھنے لگا۔ جیسے دیوتا اکٹھے ہو کر۔ کرنوں کی ڈوریوں میں باندھے

کسی حسین شہزادہ کو کشاں کشاں لئے جا رہے ہوں۔ بستی کے چھوٹے سے میدان میں جنگلی عورتیں اور مرد اکٹھے ہو گئے۔ اور گھیرے کی شکل میں برابر برابر بیٹھ گئے۔ سردار شیر کی بچھی ہوئی کھال پر بیٹھا تھا۔

سردار کے اشارہ پر نیم برہنہ نوجوان کنواری لڑکیاں اور لڑکے گھیرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے درمیان میں کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں سے ایک دوسرے کو برہنہ کیا۔ اور چاند کی طرف دیکھنے لگے۔ چاند کی ننگی کرنیں ان کی سیاہ آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔ گھیرے میں بیٹھے ہوئے مرد اور عورتیں اٹھ اٹھ کر ان کے گلوں میں ہار ڈالنے لگے۔ رقص کا آغاز ہوا۔

چاندنی رات میں درختوں کی چوٹیاں سر جوڑے کھڑی تھیں۔ ناچنے والوں کے گلوں میں پڑے ہوئے جنگلی پھولوں اور پتوں کے ہار ناف تک لٹک رہے تھے۔ جنگلی مست تھے۔ ناچنے والے ایک ساتھ اپنے ہاتھوں کو چاند کی طرف بلند کرتے اور پھر اپنے سروں کو جھٹکا دے کر ہاتھ پھیلاتے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے اور تھوڑا سا جھک کر پھر کھڑے ہو جاتے تھے۔

گھیرے میں بیٹھے ہوئے چند ادھیڑ عمر جنگلی ڈھول بجا رہے تھے۔ ناچنے والوں کے پاؤں آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ دھم۔ دھم۔ دھم ڈھول کی آواز ٹھہر ٹھہر کر فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ چاند چڑھتا گیا۔ ڈھول کی آواز بلند ہوتی گئی۔ اور رقص کرنے والوں کے پاؤں تیزی سے اٹھنے لگے۔

ناچنے والوں کے پاؤں ڈھول کی آواز پر اٹھ رہے تھے۔ اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے ہار اٹھ اٹھ کر ان کے برہنہ پیٹ سے ٹکرا رہے تھے۔ نوجوان

برہنہ لڑکیاں جب سر کو جھٹکا دیتیں اور ہاتھ پھیلاتیں تو گلے میں پڑے ہوئے پتوں کے درمیان ان کی انگوری چھاتیاں اس طرح ہلتیں۔ جیسے آم کی شاخوں میں چھپی ہوئی گدرائی ہوئی کیریاں ہوا کی ہلکی سی جنبش سے ہل رہی ہوں۔

چاند چڑھ کر ڈھلنے لگا۔ ڈھول کی آواز چاند کی رفتار کے ساتھ ساتھ بتدریج گھٹتی گئی۔ ناچنے والوں کی رفتار میں کمی آگئی۔ اور برہنہ رقاص آمنے سامنے ہو گئے۔ وہ ناچتے ہوئے آگے بڑھتے اور ایک دوسرے کے قریب آکر پھر پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ رقاص اپنے آپ سے بے خبر رقص میں مصروف تھے جنگل کی فضا اندر کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی۔ گھیرے میں بیٹھے ہوئے لوگ اُونگھنے لگے۔ ہوا کا ایک لطیف جھونکا آیا۔

ناچنے والے تھک کر چور ہو گئے۔ نیند ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی اور وہ گھیرے کے درمیان ہی گر پڑے۔

ان کی نگاہیں درختوں کی چوٹیوں کو چھوتے ہوئے چاند پر تھیں۔ اور آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔

"سومی! مجھ سے دور دور کیوں رہتی ہے۔ رات کئی دنوں کے بعد تجھے دیکھا ہے کیا سانو مجھ سے زیادہ بہادر ہے؟ کیا میرا بھالا شیر کے جگر کو نہیں پھاڑ سکتا؟"

دوسرے دن سانو جنگلیوں کے ساتھ شیر مارنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ سومی کانگو کے کنارے منہ ہاتھ دھو کر کھڑی ہی ہوئی تھی۔ کہ ایک اکہرے بدن کا نیگرو کمر سے خنجر لگائے ہاتھ میں بھالا لئے ہوئے ایک طرف سے نکلا اور سومی کے قریب پہنچا۔

"دیکھ جولا۔" ابھی سومی اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ جولا نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"سومی۔"

"ہٹ۔ جا۔" سومی نے اس کے ہاتھوں کو جھٹک دیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔

"میرے منہ نہ لگ جولا۔ میں تجھ سے کئی دفعہ کہہ چکی ہوں۔"

"سومی!"

"دفع ہو جا یہاں سے۔"

"سومی! میری محبت کی ہنسی نہ اڑا۔"

"ارے واہ یہ اچھی دھونس ہے تیری"

"دھونس نہیں۔ محبت ہے۔"

"چل رہے۔ بڑا آیا محبت والا"

"سومی!" نوجوان جولا کرخت آواز میں بولا۔

"پانی میں ذرا اپنی شکل دیکھ" سومی کے ان الفاظ نے آگ پر تیل چھڑک دیا۔

"اچھا! تو تو بھی کیا یاد کرے گی۔" جولا نے غصہ میں آکر نیزہ پھینک دیا۔ اور کمر سے خنجر نکال کر سومی کی طرف بڑھا۔ سومی بستی کی طرف بھاگنے کی بجائے دریا کے کنارے کنارے کیلے اور بید مجنوں کے درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے رینڑ کے جھنڈ کی طرف بھاگی۔ جولا بھی اس کے پیچھے لپکا۔ لیکن زمین پر پڑے ہوئے اپنے ہی نیزہ سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ جولا نے اٹھ کر زمین پر پڑے ہوئے نیزہ

کوکئی ٹھوکریں لگائیں۔ اور پھر کچھ سوچ کر اس نے نیزہ اٹھالیا۔

"سومی ٹھہر جا۔ ورنہ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑونگا" جولا سومی کے پیچھے بھاگا سومی ربڑ کے جھنڈ میں گھس گئی۔ اور جولا بھی اس کے پیچھے پیچھے جھنڈ میں داخل ہوگیا۔ سومی ربڑ کے جھنڈ میں سے نکل کر سامنے کھڑے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں گھسنے کے لئے ناریل کے درختوں کے قریب سے گزری۔ جولا نے بڑھ کر نیزہ پھینکا۔ نیزہ سومی کو لگنے کی بجائے ناریل کے درخت میں پیوست ہوگیا۔ درخت پر چڑھی ہوئی جنگلی گلہریاں چلائیں۔ اور سومی نیزی سے دوسرے جھنڈ میں گھس گئی۔

"ٹھہرو!" ایک سفید فام شخص ہاتھ میں رائفل لئے ہوئے درختوں کے عقب سے نکلا۔ اور دونوں کے درمیان آکھڑا ہوا۔

"تم ایک عورت پر ہاتھ اٹھانا چاہتا ہے" سومی دوڑ کر سفید فام شخص کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔ جولا کے غصے کے مارے نتھنے پھول رہے تھے۔ نووارد شخص کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور وہ اس کی طرف بڑھا۔ جولا کی نظر اچانک رائفل پر پڑی۔ رائفل کو دیکھ کر جولا ٹھٹکا اور وہیں کھڑا ہوگیا۔ سفید فام شخص کی آواز سن کر اس کے دو جنگلی ساتھی ایک طرف سے نکل آئے۔

"صاحب کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں" سفید فام شخص جس کا نام گرے تھا۔ سومی کی طرف بڑھا۔ اور جولا بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔

گرے عرصہ سے افریقہ کے جنگلوں میں شکار اور سیاحی کی غرض سے گھوم رہا تھا۔ دو سال قبل بھی یہ اسی جگہ آکر ٹھہرا تھا۔ اور آج بھی اپنے دو جنگلی نوکروں کے

ساتھ اس جگہ پہنچ گیا تھا۔ گرے کے چند ساتھی کسی اور سمت جنگل نوردی کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ نیگرو بستی سے کچھ فاصلے پر کسی وقت ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی ویران پڑی تھی۔ جو کہ آس پاس کے جنگلیوں میں بھوتوں کے مسکن کے نام سے مشہور تھی۔ نیگرو اس طرف آتے ہوئے ڈرتے تھے۔

گرے سومی کے ساتھ جھونپڑی کے باہر بیٹھ گیا۔ اس کے جنگلی ساتھی سوکھی لکڑیاں جمع کرنے لگے۔ سومی تھوڑی دیر تو گھبرائی۔ لیکن پھر اس نے خود بخود تمام واقعات رک رک کر بتلا دیئے۔

گرے نے پینٹ کی جیب سے سگار نکال کر سلگایا۔ اور دھوئیں کے بادل اڑانے لگا۔ سومی میٹھی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گرے نے سومی کی ان سیاہ آنکھوں میں جو کہ گھنیری پلکوں کے سائے میں چمک رہی تھیں۔ اپنی تصویر دیکھی اور مسکرا دیا۔ گرے اور سومی ایک دوسرے کو پیار کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کہ ایک شیر درختوں کے پیچھے سے نکل کر دھاڑا۔ سومی گرے سے لپٹ گئی۔ گرے نے سومی کو علیحدہ کر کے رائفل اٹھائی اور دو تین فائر کئے۔ شیر ڈھیر ہو کر زمین پر گر پڑا۔ رائفل کی آواز سن کر گرے کے جنگلی ساتھی دوڑتے ہوئے آئے اور شیر کو مرا ہوا دیکھ کر مسکراتے ہوئے جھونپڑی کے عقب میں چھپ گئے۔

سومی شام ہونے تک وہیں بیٹھی رہی۔ جب درختوں کے سائے پھیل کر لمبے ہو گئے۔ تو سومی جانے کے لئے اٹھی۔ نوجوان گرے بھی ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں درختوں کو پار کر کے کیلوں کے جھنڈوں کے قریب جا نکلے۔ سامنے بستی کی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ سومی دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے

چلی گئی۔ اور گرے واپس آگیا۔

سومی اور گرے کو ملتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ اور دو جوانیاں ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگیں۔

ایک دن سومی بید مجنوں کے جھنڈ کے قریب سے گزر رہی تھی۔ کہ سامنے سے ساتو آگیا۔ سومی نے بچ کر نکل جانا چاہا۔ لیکن ساتو نے اس کا راستہ روک لیا۔

"سومی تو اتنے دن سے کہاں تھی؟"

"یہیں تھی۔ جاتی کہاں؟"

"جھوٹ نہ بول۔ میں سارا سارا دن تجھے ڈھونڈتا رہا ہوں۔"

"واہ رے۔ مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت۔ میں نے کسی کی چوری کی ہے کیا۔"

"سومی! تیری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تیرے من میں کھوٹ ہے۔" ساتو نے سومی کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ سومی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور تنک کر بولی۔

"مجھے یہ دل لگی اچھی نہیں لگتی۔ میرا راستہ چھوڑ دے۔"

"اچھا! اتنا نخرہ؟"

"نخرہ تجھ پہ تھوڑی ہے۔"

"اور کس پہ ہے۔" ساتو نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

"ہٹ جا۔"

"اوہو۔ آج تو مزاج میں بڑی گرمی ہے۔" اپنا بھالا زمین پر ٹکا کر اس نے

زور دیتے ہوئے ساتو بولا۔

"آج کہاں کی تیاری ہے؟"

"کہیں جاؤں۔ تو کون ہوتا ہے پوچھنے والا؟" سوہی یہ کہہ کر آگے جانے کی بجائے بستی کی طرف واپس چلی گئی۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی ساتو بید کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ سورج کی کرنوں کا جال پھیلنے لگا۔ سوہی بستی کی طرف سے آئی۔ اور ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی بید مجنوں کے درختوں کے قریب سے گزر کر سرکنڈے کے جھنڈ میں گھس گئی۔ ساتو بید کی آڑ سے نکلا اور سوہی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

سوہی درختوں کو پار کر کے گرے کے پاس پہنچی۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سوہی کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھا۔ سوہی نے لپک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور دونوں جھونپڑی کے باہر بچھی ہوئی شیر کی کھال پر بیٹھ گئے۔

"اچھا تو یہ بات ہے!" ساتو درختوں کی آڑ سے نکل کر سامنے آگیا۔ سوہی ساتو کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ گرے بھی اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ کون ہے؟" ساتو نے گرے کی طرف بھالے سے اشارہ کیا۔

"نہیں بتلاتی۔ تو میں خود اس سے پوچھ لیتا ہوں۔" ساتو نے اپنا بھالا اٹھایا

"ساتو!۔ نہیں" سوہی چیختی ہوئی گرے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"ساتو واپس چلا جا"

"اور تو یہاں مزے کرے"

"ساتو!" سوہی پھر چلائی "تجھے کوئی حق نہیں، مجھے کچھ کہنے کا"

"اچھا۔ اس بات کو یاد رکھیو!" ساتو غصے سے کانپتا ہوا جدھر سے آیا تھا۔ ادھر ہی چلا گیا۔

دوسرے دن ساتو سردار سے ملا۔ بستی میں ساتو اور سومی کے سنجوگ کا اعلان کر دیا گیا۔

ابر پارے آسمان پر لڑھک رہے تھے۔ بستی میں دھوپ چھاؤں آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔ سورج شرما کر جھک گیا جھونپڑیوں سے نکل نکل کر نیگرو عورتیں اور مرد ناریل کے درختوں کے قریب جمع ہو گئے۔ ساتو بھالا ہاتھ میں تھامے ہوئے سردار کے بائیں طرف آکر بیٹھ گیا۔ سردار نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور ساتو کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد اس کی نظریں ہر جنگلی کے چہرے پر چھٹتی ہوئیں سومی کے چہرے پر جا کر رک گئیں۔

"سومی!۔ اٹھو۔"

"نہیں۔ سومی اپنی جگہ ۔۔۔ نہیں اٹھ سکتی۔" سومی کی بجائے مجمع میں سے جولا نے جواب دیا۔ بھرے مجمع میں سردار کی ہتک ہو گئی جنگلی عورتیں اور مرد جولا کی طرف دیکھنے لگے۔

"جولا! میں سردار ہوں۔ میں نے سب کو اپنی طاقت سے زیر کیا ہے۔ مجھ سے ٹکر لینا، موت کو بلانا ہے۔ میں تیری اس نادانی کو معاف کرتا ہوں، سومی کو آنے دو۔"

"میں نے بکری نہیں باندھا ہے۔ ہمت ہے تو بلا لو!" جولا اسی لہجے میں بولا۔

"جولا!" سردار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے برابر رکھے ہوئے چوڑے

پھل والے کلہاڑے کو جس میں چھوٹا سا لکڑی کا دستہ لگا ہوا تھا۔ اٹھا لیا اور چیخ کر کھڑا ہو گیا۔ جولا نے اپنی گود میں رکھا ہوا نیزہ اٹھایا اور بیٹھے بیٹھے سردار کی طرف پھینکا۔ نیزہ سردار کے حلق سے پار نکل گیا۔ سردار گر پڑا۔ سردار کے گرتے ہی جولا پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور سردار کے قریب آ کر اپنی کمر سے خنجر کھینچ لیا۔ اور جنگلیوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"ہے کوئی مرد جس نے شیرنی کا دودھ پیا ہو" سب کی گردنیں جھک گئیں نیگرو مرد اور عورتیں سب سجدہ میں گر گئے جولا سے کوئی آنکھ نہ ملا سکا۔ اور وہ سردار تسلیم کر لیا گیا۔

"کل سومی میری ہوگی" جولا نے اپنی کمر میں خنجر لگا لیا۔ اور سردار کے قریب پڑا ہوا کلہاڑا اٹھا کر ایک طرف چل دیا۔

دوسری شام سردار جولا اکڑ کر شیر کی کھال پر بیٹھ گیا جنگلی مرد اور عورتوں کی گردنیں جھک گئیں۔

"سومی!" جولا چلایا۔ سومی چپ چاپ اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔

"ڈرو نہیں —" جولا نے دوبارہ کہا اور سومی اس کی طرف بڑھی

"سومی! —" ساتو نے کھڑے ہو کر خنجر نکال لیا۔ سومی ٹھہر گئی

"ساتو!" جولا چلایا

"کیوں ڈر گئے — ؟"

"نہیں —" جولا گرجا اور اس نے اپنے برابر پڑا ہوا کلہاڑا اٹھا لیا۔

"نہیں۔ ساتو نہیں" سومی دوڑ کر ساتو سے لپٹ گئی۔ اور پھر ساتو سے علیحدہ

ہو کر جولا کی طرف بڑھی۔

"سردار! معاف کردو! یہ نادان ہے سردار۔"

"سومی ہٹ جاؤ! کس کے منہ لگتی ہو۔" سانو نے آواز دی

"نہیں سانو نہیں" سومی چیختی ہوئی آگے بڑھنے کی بجائے سانو کی طرف لپکی سانو نے اسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔ اور خود جولا کی طرف بڑھا۔

جولا نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کلہاڑا پھینک دیا اور کمر سے دو دھارا خنجر نکال کر اپنی جگہ سے کودا۔ نیگرو مرد اور عورتیں ادھر ادھر پھیل گئے۔ بیچ میں خنجر زنی ہونے لگی۔ خنجر خنجر سے ٹکرا رہا تھا۔ کبھی جولا آگے بڑھ جاتا اور سانو پیچھے ہٹ جاتا۔ اور کبھی سانو پیش قدمی کرتا اور جولا وار روکتا ہوا واپس ہٹ جاتا۔

جولا اور سانو نے خنجر سے خنجر ملائے اور ایک دوسرے کی نگاہوں میں نگاہیں گاڑ دیں۔ سانو نے جولا کو دھکیل کر پرے گرا دیا۔ سومی کے منہ سے چیخ نکل گئی سومی کے چیخ مارنے پر سانو نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ جولا تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور دوڑ کر اس نے اپنا دو دھارا خنجر دستہ تک سانو کے پہلو میں اتار دیا۔ سانو گر پڑا اور سومی دوڑ کر جولا سے لپٹ گئی۔ جولا پھر جیت گیا۔

گرے پائپ میں تمباکو بھرتا ہوا جھونپڑی سے نکلا۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ ٹھہر گیا۔ اس نے پائپ دانتوں تلے دبا کر دیا سلائی جلائی اور تمباکو کو لگا کر یکے بعد دیگرے دو تین کش لگائے۔ دھواں پائپ سے ٹکرا کر گرے کے کھچڑی جیسے بالوں کو چھوتا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔

"یہاں سے نکل چلو" سوی کا سانس پھول رہا تھا۔ اس نے آتے ہی گرے کا
بازو پکڑ لیا۔ اور بولی

چھوٹے بڑے مسکراتے ہوئے پھول پاس سے گزر گئے۔ اور وہ نعیم کے آگے آگے بیموؤں کے گہرے جھنڈ میں گھس گئی۔

"عجیب انسان ہو تم بھی"، بیموؤں کی آڑ میں پہنچ کر کلثوم رکی اور اس نے اپنا نقاب الٹ لیا۔

"عجیب"۔ نعیم حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"بڑی مسکین سی صورت بنائی ہے۔ جیسے کچھ پتہ ہی نہیں"

"میں کچھ..."

"ہاں ہاں بہت بھولے ہو نا کچھ سمجھے نہیں"

"واقعی میں کچھ نہیں سمجھا"

"پہلے بیٹھ تو جائیے۔ پھر سمجھ بھی جاؤ گے" کلثوم ہنس پڑی اور دونوں قریب قریب بیٹھ گئے۔

"میرے سامنے بیٹھو ادھر۔ اوہو بیٹھ بھی جاؤ"۔ نعیم کلثوم کے سامنے بیٹھ گیا۔

"تم اچھے بھی ہو اور برے بھی۔ کلثوم نے اپنا ہاتھ بڑھا کر نعیم کے الجھے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیاں گھسا دیں۔ اور اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو آہستہ آہستہ اٹھا کر اس کی پیشانی پر مارنے لگی۔

"فرحت کو بہت گھور گھور کر دیکھا جا رہا تھا"

"فرحت" نعیم کے دل میں درد اٹھا۔ اور اس نے اپنی پلکیں اٹھا کر کلثوم کی طرف دیکھا۔

"... وہ بھی کیسی بھولی بنتی ہے۔ اور اپنے آپ کو شریف جتاتی ہے جیسے مجھے

معلوم ہی نہیں۔ خبر نہیں وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔" کلثوم پھر بولی

"وہ میری سہیلی ہے۔ لیکن تم۔ تم۔" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اور اُس نے اپنا سر نعیم کے سینے سے لگا دیا۔

"میں صرف تمہیں ایک جھلک دیکھنے کے لئے آئی ہوں۔ ورنہ فرو سے بات بھی نہ کروں۔ کلثوم ہاتھ کی مٹھی میں ہری ہری دوب لے کر اکھاڑنے لگی۔

"فرو بڑی چالاک لڑکی ہے۔ تم اُس کے ہتھکنڈوں کو نہیں جانتے۔" کلثوم اپنا سر اٹھا کر دھیرے دھیرے اس کی چھاتی پر مارنے لگی۔

"فرو" نعیم کا دل کسی کی یاد میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ اور اس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ کلثوم یونہی اس کا ذکر چھیڑتی رہے۔

"نعیم۔!" کلثوم ہری پتی منہ میں لے کر دانتوں سے کھیلنے لگی۔

"ہوں۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ بولتے کیوں نہیں۔" کلثوم نے اٹھ کر نعیم کی پیشانی چوم لی۔

"تم بہت اچھی ہو۔"

"سچ نعیم۔"

"ہاں" نعیم نے سر ہلا دیا اور کلثوم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پہلے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اور پھر اس پر گال رگڑنے لگی۔

"دو باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ آؤ اب چلتے ہیں"

"چلئے" نعیم کھڑا ہو گیا۔ کلثوم کے ماتھے پر شکن پڑ گئے اندر وہ ناگن کی طرح اندر ہی اندر بل کھاتی ہوئی اٹھی۔ اس کا خیال تھا کہ نعیم مجھے روکے گا۔ لیکن اس نے

روکا تک نہیں۔

" اچھا آئندہ ہفتہ اسی دن ۔۔ ضرور ملنا ۔" چلتے چلتے کلثوم بولی

" اچھا "

" اچھا " کلثوم نے اپنا سر تھوڑا سا ایک طرف جھکا کر اپنی ناک کو اوپر چڑھایا اور مسکرا کر منہ پر نقاب ڈال لی ۔

" فرحت ۔ فرو ۔" نعیم سر کو جھکائے چل دیا ۔

" کہاں تھے اتنی دیر سے ۔ یہاں تو انتظار کرتے کرتے آنکھیں بھی پتھرا گئی ہیں ۔" نعیم کے مکان میں گھستے ہی نسرین نے اس کا رستہ روک لیا ۔

" تو کہاں کی " نعیم کچھ کہنے ہی لگا تھا ۔ کہ درمیان میں ہی ٹھہر گیا اور آہستگی سے بولا ۔

" کہیں نہیں ۔ بس یونہی ذرا ۔۔۔۔"

" میں سب جانتی ہوں ۔" نسرین جھٹ سے بول اٹھی ، نعیم کو غصہ آگیا ۔ اور تیزی میں آکر بولا

" اچھا جانتی ہے تو ۔"

" نعیم ۔ !"

نعیم آگے بڑھ گیا ۔ اور نسرین اپنا سا منہ لے کر ایک طرف ہٹ گئی ۔

سامنے جنگلے میں کھڑی فرحت دھیرے دھیرے لوہے کی سلاخ کے ساتھ اپنے گال کو سہلا رہی تھی ۔ نعیم چپکے سے جا کر کھڑا ہو گیا ۔ اور فرحت کو گھور گھور کر دیکھنے لگا ۔ فرحت کی نگاہ نعیم پر جا پڑی ۔ اور اس کو اپنی طرف میٹھی نگاہوں سے

دیکھتے ہوئے پاکر شرماتی ہوئی کواڑ کی آڑ میں ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد فرحت پھر سامنے آئی اور اپنا سر سلاخوں کے ساتھ لگا کر پیچھے پھر کر کھڑی ہو گئی۔

نعیم وہیں کھڑا رہا۔ کچھ وقت گزرنے پر نعیم کو نسوانی قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ فرو سامنے سے ہٹ گئی۔ نعیم سمجھ گیا۔ کہ اس کی سہیلیاں آگئیں۔ فرحت کے چلے جانے کے بعد نعیم بیٹھ گیا۔ اور گاہے گاہے نظریں اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"میں تو اوپر جاؤں گی"

"رضیہ! رضیہ!! اور جو کی بچی۔ مت چڑھ اوپر۔ دھوپ تیز ہے"

"اوں۔ بلا سے" رضیہ کسی کو انگوٹھا دکھا کر جلدی جلدی اوپر چڑھ گئی۔ اور نعیم کو سامنے بیٹھے ہوئے دیکھ کر جھٹ سے نیچے بیٹھ گئی۔

"ہو ہو۔ سخت گرمی ہے یہاں تو" رضیہ کھڑے ہو کر نعیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی

"میرے اللہ۔ لوگ کیسے اوپر بیٹھ جاتے ہیں" رضیہ مسکرائی اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی نیچے اتر گئی۔

"ایک اور لو" نعیم بیٹھے بیٹھے ہنس پڑا۔ اس کا دل گہری جھیل کے مانند پر سکون تھا۔

"میلی باجی نے کتاب دی ہے۔ وہاں نقصان ہے۔ ٹھیک مانے بتادو"

"معنی بتادوں"

"ہاں" شفق کی سرخی ناکام عاشقوں کی مجروح روحوں کی طرح افق مغرب میں بے بال و پر نہ ڈلا رہی تھی۔ اور کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے بادلوں کی سرمئی

ٹکڑیاں بکھری ہوئی تھیں ۔ ابابیلیں شور مچا رہی تھیں ۔ کہ ایک چھوٹی سی بچی کتاب لے کر نعیم کے پاس آئی

" تمہاری باجی تنہا پڑھتی ہیں؟ " کتاب لے کر نعیم نے جنگلے کی طرف دیکھا۔ سامنے فرحت کھڑی تھی ۔

" انگلیجی "

انگلیجی " نعیم مسکرا دیا

" ہوں " نعیم نے کتاب کھولی " آپ اوپر نہ آیا کریں " پہلے ہی صفحے کے حاشئیے پر چند الفاظ لکھے ہوئے تھے ۔

" کیوں ؟ ۔ کیوں مجھے برباد کرنے پر تلی ہو ؟ " نعیم نے جیب سے پنسل نکال کر اسی جگہ لکھ دیا ۔

" لو "

" تنہا نہوں " بچی نے کتاب واپس لے کر نعیم کی طرف دیکھا ۔

" یہی کہ بیٹھے مجھے بھی نہیں آتے "

" اچھا " بچی چلی گئی ۔ نعیم نے فرحت کی طرف دیکھا ۔ لیکن وہ جا چکی تھی ۔ اور سامنے جنگلے کی سلاخوں کے درمیان ایک چھوٹی سی چڑیا بیٹھی ہوئی تھی ۔

" مجھے ذرا اپنی کتاب دے دیں ۔ لال جلد والی "

دوسرے دن نعیم ابھی نہا کر فارغ ہی ہوا تھا ۔ کہ وہی بچی مٹھی میں دبائے ہوئے ایک پرچہ لے کر آئی ۔ نعیم نے پرچہ پڑھ کر بچی کی طرف دیکھا ۔

" یہ تنہا نہا ہے تمہاری باجی نے "

"باجی نے نہیں۔ رجیہ آپا نے کہا ہے"

"کیا کہا ہے؟"

"وہ چیت لو۔" بچی نے کاغذ کے پرزہ کی طرف اشارہ کیا۔ نعیم کچھ دیر تو کھڑا سوچتا رہا۔ اس کے بعد سیٹی بجاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے باہر نکلا۔

"لو۔ باجی کو نہیں۔ آپا کو دینا"

"اچھا" بچی چلی گئی۔

"عجیب تماشہ ہے"

سورج کی نگاہوں میں تیزی آگئی۔ گھڑی کی دونوں سوئیاں آپس میں گتھ گئیں اور نعیم چارپائی پہ دراز ہو کر اونگھنے لگا۔

"بابو جی"

"ہوں"

"بابو جی" بچی کے دوبارہ ہاتھ لگانے پر نعیم اٹھ کر بیٹھ گیا بچی نے کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ میں تھما دیا۔

"آگ تو لگا دی۔ اب خدارا ہوا دے کر اور نہ بھڑکاؤ" فرحت کی تحریر پڑھتے ہی نعیم کی اونگھ اڑ گئی۔ اور اس نے قلم اٹھا کر جواب میں لکھا۔

"جو خود آگ میں گھرا ہو۔ وہ غریب کسی کی آگ کو کیا ہوا دے گا"

بچی چلی گئی۔ اور نعیم کی امید کے مطابق تھوڑی ہی دیر پھر پیغام لے کر آگئی۔

"کل رات ۱۲ بجے ہمارے گھر میں داخل ہو جانا۔ بے دھڑک"

بجی چلی گئی اور نعیم خیالات کے محل بنا بنا کر مسمار کرنے لگا۔

رات سیاہ لبادہ اوڑھ کر چوروں کی طرح دبے پاؤں نکلی۔ اور اُس نے گھومتے ہوئے گلوب کو اپنی باہنوں میں لے لیا۔

"نعیم۔ مجھے زندہ درگور نہ کرو۔ میں یہ عذاب برداشت نہ کرسکوں گی" نعیم فرحت کے مکان کے بیرونی دروازہ کو آہستہ سے دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ فرحت اس سے چمٹ گئی۔

"فرو۔ میں کس طرح دن گذار رہا ہوں۔ کبھی یہ بھی سوچا؟"

"تم کس طرح دن گذار رہے ہو۔ میں جانتی ہوں۔ کبھی رضیہ۔ کبھی سعیدہ۔ کبھی کلثوم۔ جب سامنے آئیں تو بے چاری فرو کس گنتی میں ہے" فرو علحدہ ہو گئی۔

"فرو۔ ایسا نہیں۔ سب کچھ تمہارے لئے ہے" نعیم اس کی طرف بڑھا۔

"اچھا" فرو نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "بے سوچے سمجھے اپنی نیا کو بحرِ عشق کے حوالے کر چکی ہوں۔ اب میری تقدیر۔ چاہے وہ کنارے پر لگے۔ یا بیچ بھنور میں ڈوب جائے"

"نہیں فرو۔ اتنی ناامیدی بھی اچھی نہیں"

"ناامید تو نہیں۔ البتہ ڈرتی ضرور ہوں۔ خدا وہ گھڑی نہ لائے۔ کہ مجھ ابھاگن کی زندگی ہی اجیرن ہو جائے۔ اور تم ــــ تم مجھے" فرو بڑھ کر نعیم کے سینے سے لگ گئی۔ اور نعیم کو اپنا دل بے کنار ظلمتوں کی گہرائیوں میں سے آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔

"فرو! جب مستقبل کے خیالات سے زیادہ گھبرا جایا کرو۔ تو اپنے دل سے پوچھ لیا کرو۔ یہ تمہیں سب کچھ بتلا دیا کرے گا۔ اور جنگلی کا ضامن ہوگا۔"

"نہیں نعیم۔ میں نے نہیں، جنگلی کسی اور نے کہا تھا۔" نعیم اور فرو خیالات کی لہروں میں ڈوبتے اُبھرتے رہے۔ اور رات بہے چلی گئی۔

کلیوں نے مسکرا مسکرا کر انگڑائیاں لیتے ہوئے اپنی آغوش کھول دیں اور بھونرے جھوم جھوم کر کلی کلی منڈلانے لگے۔ ہرجائی محبوبہ کی روح کو آرام ملا۔ اور اس کا انگ انگ مسکا اٹھا۔

"آپ"

"ہاں میں۔ گھبرا کیوں گئے۔"

"یہ بات تو نہیں سعیدہ۔ لیکن اگر کوئی......"

"گھبراؤ نہیں۔ گلی سنسان پڑی ہوئی ہے۔"

"پر۔ میں"

"میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں۔ لیکن میں کیا کروں؟ یہ دل ہی بدبخت ہے جو ایک سنگدل انسان پر مرمٹا۔" سعیدہ نعیم کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اور نعیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم اسی طرح لیٹے رہو! مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔" سعیدہ نعیم کو زبردستی لٹا کر اس کے سینے پر گر پڑی۔ اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کے بالوں میں ڈال کر آہستہ آہستہ شانہ کرنے لگی۔

"سعیدہ سنو تو"

"اب کیا سننا - ہر آ کر چلی بھی گئی ہے - اب تو ساحل کے سینے پر صرف نشان باقی ہے - جو کہ دور سے ہی نظر آ رہا ہے" سعیدہ نے اپنے لب نعیم کے ہونٹوں پر رکھ دئے۔

"سعیدہ!" نعیم نے ایک دو مرتبہ اپنا سر ادھر ادھر مارا - آخر بے سدھ ہو کر پڑ گیا - پھر نذرانہ ثبت کر کے سعیدہ چلی گئی - اور نعیم پڑا ہوا دل کی دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔

"فرحت! - ایک تو ہی سنگدل ہے - تیرے لئے میرا دل تڑپتا ہے - اور تو آتی بھی نہیں - اور جنہیں میں نہیں چاہتا - وہ خود بخود پکے ہوئے پھل کی طرح گری جاتی ہیں - مجھے ان کی ضرورت نہیں - میرا دل تو صرف تیرے ہی نام پر دھڑکتا ہے - تو آ جا اور چندا کی کرن کی مانند جھوکے سے ہی ٹوٹ کر میری باہوں میں گر جا - میں جی بھر کر پیار کروں گا - میری مرادوں کی یہی انتہا ہے" نعیم چارپائی سے اٹھا اور جوتا پاؤں میں ڈال کر بلکہ پر پہنچا۔

"لاؤ میں چلاؤں۔"

"رہنے دے جاہل! ہر وقت ہی سر پر فرشتے کی طرح کھڑی رہتی ہے" نعیم نے نسرین کو جھڑک دیا۔

"میں نے کچھ پڑھا نہیں جبھی تو" نسرین کے دل پر چوٹ لگی اور وہ وہاں سے چلی گئی۔

ہوا سر سرائی اور شام کے سائے گھل مل گئے - کلثوم فرحت کے گھر سے نکلی۔ اور نعیم اس کے پیچھے پیچھے چل دیا - دونوں دیکھے بھالے راستے کو طے کرتے ہوئے لیموؤں

کی گہری چھاؤں میں پہنچ گئے۔

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم آؤ گے ہی نہیں۔" کلثوم نے نقاب الٹ دیا۔ اور آگے بڑھ کر اپنے ہونٹ نعیم کے لبوں سے چھو کر واپس ہٹا لئے۔ نعیم چپ رہا۔ اور وہ گھاس پہ بیٹھ گئی۔

"نعیم۔۔!"

"ہوں۔"

"ہوں ہوں۔ جیسے بولتے ہوئے بھی کچھ خرچ ہوتا ہے۔" کلثوم بگڑ کر بولی اور نعیم مسکرا کر بیٹھ گیا۔

"میں جانتی ہوں تمہیں فرحت چاہیئے۔

"فرحت۔" فرحت کے نام پر نعیم نے نگاہیں اٹھائیں اور کلثوم کی طرف دیکھا

کلثوم آگے کو جھکی۔ اور نعیم کے ہونٹوں کو اپنی انگلیوں سے بھینچ کر بولی۔

"فرو بنتی تو بہت چالاک ہے۔ لیکن اسے یہ خبر نہیں کہ تاڑنے والے مستقبل میں جنم لینے والے واقعات کو بھی بھانپ لیتے ہیں۔ حال کا تو کہنا ہی کیا۔ ـــــــ

لیکن مجھے کیا۔ میری بلا سے۔ جو ہوتا ہے۔ ہوا کرے۔ یہ تو اپنا اپنا نصیبہ ہے۔" کلثوم نعیم کی گود میں آ پڑی۔ سورج نے جمائی لی۔ اور درختوں کے سایوں کا رشن بچھا کر بیمود کے پیچھے لمبی تان کر سو گیا۔

" نعیم نے گھر میں داخل ہوتے ہی ننھے قاصد کو دیکھا۔ اور لپک کر اس کے ہاتھ سے کتاب لے لی۔

"آج رات کیا دیار محبت کو جنت نہ بنائیے گا؟" ورق گردانی کرتے وقت کتاب

کے بیچ میں سے ایک پرچہ نکلا۔

"کیوں نہیں۔ ایک گنہگار کو اور کیا چاہیئے!" نسیم نے اسی پرچے کی پشت پر جواب لکھ کر کتاب میں رکھ دیا اور کتاب ننھے قاصد کے ہاتھ میں تھما دی۔ ننھا قاصد دوڑ گیا

"میرے دیوتا!" ہوا میں خنکی تھی کہ نعیم رات کے سناٹے میں فرحت کے گھر داخل ہوا اور فرحت ہمیشہ کی طرح اس سے چمٹ گئی۔

"فرو"

"جی"

"کیا بات ہے؟"

"طبیعت بہت اداس ہے جی گھبرا رہا ہے" بھرائی ہوئی آواز میں فرو بولی۔

"اتنی اداسی بھی اچھی نہیں" نعیم نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا

"میں کیا کروں؟ آتشِ محبت تو مجھے اندر ہی اندر جلائے جا رہی ہے۔ مجھے اپنی زیست کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گمنام صحرا کی کسی نامعلوم راہ پر رکھا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ خبر نہیں۔ کس وقت بادِ ممات کا بے رحم جھونکا آجائے۔ اور شمع ہستی ریگ زاروں میں ہی ختم ہو جائے۔ اس کا پتہ بھی باقی نہ رہے۔ اور کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ کون سر پھرا دنیا میں آیا اور نامراد چلا بھی گیا۔"

"فرو۔ یوں دل مت توڑو!"

"کب سے کھڑے ہو۔ بیٹھ جاؤ" فرحت اور نعیم قریب ہی پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"تو یہ اپنے کاندھوں پر ڈال لو" فرو نے اپنے کاندھوں پر پڑی ہوئی شال اتاری

"نہیں فرو۔"

"اچھا تو دونوں ہی اوڑھے لیتے ہیں۔" نعیم اور فرو برابر برابر مل کر بیٹھ گئے۔ اور شال اپنے کاندھوں پر ڈال لی۔

"سنا ہے چھٹیوں کے بعد تم اپنے گھر چلے جاؤ گے؟ تب کیا ہو گا؟"

"اس وقت ہم جیون ساتھی بن چکے ہوں گے۔"

"نعیم" فرحت نعیم کے سینے سے لگ گئی۔

"سچ۔"

"نعیم!" فرحت سینے پر اپنا سر اٹھا کر بولی "یاد رکھنا! اگر تم مجھے چھوڑ گئے تو میں کچھ کھا لوں گی۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو فرو" نعیم نے فرحت کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر زور سے بھینچا اور نعیم کا دل دھڑک دھڑک کر فرحت کے نرم و گداز سینے سے ٹکرانے لگا۔

"نعیم"

"ہاں فرو"

"فرو نہیں۔ میری فرو۔"

"میری فرو"

"ایک بار پھر"

"میری فرو"

"میرے نعیم" فرحت نے اپنا سر آہستہ سے نعیم کے دھڑکتے ہوئے دل پر رکھ دیا۔

"مجھے چھوڑ نہ جانا!"

"پگلی۔"

"وعدہ کرو!"

"وعدہ رہا۔ تم تو میری دھڑکن ہو"

"اگر تم چلے گئے تو۔"

"ارے نہیں" نعیم نے فرحت کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"بالفرض"

"تو چند دن کے بعد پھر لوٹ آؤں گا۔ میں وہاں رہ ہی نہ سکوں گا۔"

دن رات آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ دن آیا۔ تو رات چھپ گئی۔ رات نکلی تو دن غائب ہو گیا۔ کبھی عاشق صادق رویا۔ تو کبھی باوفا محبوبہ مہجور گھڑیوں کی آگ میں پھنکنے لگی۔

ایک دن سورج نکلا۔ بھورے بھورے بادل اس کے گرد منڈلا منڈلا کر اس کا منہ نوچنے لگے۔ ہوا ملگجی رنگ کے دوپٹے لہراتی ہوئی آئی۔ اور سورج کا منہ ڈھانپ دیا۔ رم جھم ہوئی۔ خنکی بڑھ گئی۔ لیکن بہار نہ تھی۔

"سعیدہ تم؟"

"حیران ہو گئے؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں"

"نعیم تم تو پرواہ کرتے نہیں۔ اس منحوس دل کی خاطر آخر مجھے ہی آنا پڑا"

"لیکن سعیدہ"

"کیا لیکن ویکن" سعیدہ نے بٹن کھول کر برقع کرسی پر ڈال دیا۔ اور بولی۔

"سو دفعہ کہہ چکی ہوں کہ جب کوئی نہیں ہوتا، تب میں آتی ہوں۔ لیکن تم ہو کہ۔۔۔۔
اچھا مجھے سردی لگ رہی ہے۔" سعیدہ لحاف کا کونا اٹھا کر اس میں گھس گئی۔ نعیم نے اٹھنا چاہا۔ لیکن سعیدہ نے اٹھنے نہیں دیا۔

گرم گرم سانسیں بے مہار بھوت پریتوں کی مانند کمرے میں چکر کھانے لگیں۔

نعیم کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور وہ واپس جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

"کیا مجھ سے ملے گا" ننھا قاصد رضیہ کا پرچہ لے کر آیا اور نعیم کے ہاتھ میں تھما کر چلا گیا۔ نعیم نے پرچہ پڑھا اور مسکرا کر پرزہ پرزہ کرتے ہوئے پھونک مار کر ہوا میں اڑا دیا۔ نعیم چلا گیا۔ نسرین کو گھر کی ہر چیز کاٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"نعیم تم!" نسرین کے اداس چہرہ پر بہار آ گئی۔ اور خوشی و غم کے ملے جلے جذبات اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر چھلک آئے۔

"ہاں میں۔ آج بھی تمہارے ہی ماتھے لگنا تھا مجھے۔ بدبخت ٹرین ہی نکل گئی۔"

سورج ڈھلنے لگا۔ کرنوں نے پیلا رنگ دھار لیا۔ نعیم جھپٹ پر چڑھ گیا۔ سورج کی پیلی پیلی کرنیں سامنے جنگلے میں سے گھس کر کمرے میں اندھیارے کو کاٹ رہی تھیں۔ نعیم دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد نعیم کو فرحت دکھائی دی اور اس کے ساتھ ہی چھریرے بدن کا ایک نوجوان۔ نعیم دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ فرحت نوجوان کے سینے سے لگ گئی اور اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دئیے۔ نعیم کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اور اسے کل کائنات گھومتی ہوئی نظر آنے لگی۔

دوسرے دن وہ اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ چاروں سہیلیوں کے قہقہوں سے در و دیوار گونج رہے تھے۔ اور جاہل نسرین ایک کونے میں کھڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ :

محبّت

بے جان مٹی میں، جان پڑ گئی۔
مصوّرِ قدرت کے ہاتھوں ایک نئی تخلیق ہوئی۔
حوا کے مجازی خدا نے جنم لیا۔
اور فرشتے سربسجود ہوئے۔

کاخِ فردوس میں ننھی سی "محبت" نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ملائک نے گود میں کھلایا حوروں نے بلائیں لیں۔ اور نورانی پنگوڑے میں اسے سلا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جوان ہوگئی۔ حوریں شرمانے لگیں۔

صد افسوس۔ آدم ذرا سی غلطی پر آسمانوں سے نکالے گئے۔ انہیں بارگاہِ ایزدی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دیس نکالا مل گیا۔ یہ محبت نے بھی سنا۔ اس کا کلیجہ دہل گیا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ فرشتوں نے لاکھ بہلایا۔

حوروں نے مل کر میٹھی میٹھی کہانیاں سنائیں۔ مگر اس کے دل کو چین نصیب نہ ہوا۔ وہ لوٹتی ہی رہی۔ راحت نہ ملی۔

ایک دن خدا کے جنم دن کی خوشی میں آسمانوں کو سجایا گیا۔ رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ اور جام پر جام، خم پر خم ٹکرا ٹکرا کر توڑے جا رہے تھے۔ فرشتے متفرق قسم کے پیارے پیارے ساز ہاتھوں میں لئے، انہیں چھیڑ رہے تھے۔ حوروں کے پائل کی جھنکار دیوتاؤں کے سینوں میں خفتہ ارمانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کر رہی تھی۔ فردوس بریں کا کونا کونا طرح طرح کے نغموں سے معمور تھا۔ اور فلک نشین جھوم رہے تھے۔ اس وقت محبت کومل کلیوں اور نوزائیدہ رنگا رنگ کے غنچوں کے سائے میں پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ عیش میں ڈوبے ہوئے طرب، طرب پکار رہے تھے۔ کہ اس نے ہمت کر کے اپنے آنسو دھوئے اور دبے پاؤں کوثر کے کنارے پہنچی۔ ادھر ادھر دیکھا اور جھٹ سے کوثر میں کود پڑی۔ معمولی سی آواز پیدا ہو کر فلک کی وسعتوں میں غائب بھی ہو گئی "کہاں گئی؟ گئی"

غسل کے بعد محبت نے نورانی لباس زیب تن کیا۔ بال بال آبدار موتی پروئے۔ نینوں میں بہشتی کاجل کے موٹے موٹے ڈورے کھینچے اور جوانی کی شراب سے مست ہو کر اٹھلاتی ہوئی چلی۔ چلتے چلتے جھکی جھکی نگاہوں سے اس نے اپنے بدن کو دیکھا اور خود ہی لجا گئی۔ اس کا دل نرم و گداز سینے میں دھڑک رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے فلک کی دریچی کھولی۔ دور۔ بہت دور۔ ارض پر نگاہ ڈالی۔ اور سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

سما کی ملکہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے دھیر بندھائی اور ہمت کر کے

اپنے مہکتے ہوئے سر کو کھڑکی سے باہر نکالا۔ خوف کچھ کم ہوا۔ اور حوصلہ بڑھا۔
چاند مسکراتا ہوا اس کے قریب سے گزرا۔ اس نے اپنی بکھری ہوئی زلفوں کو
لہرایا۔ لہراتے ہوئے گیسو چاند کے منہ پر پڑے۔ اور اس کے رخ پر مہکتے ہوئے
بالوں کا سایہ ابھر آیا۔ اور وہ لیسوزتا ہوا آگے کو سرک گیا۔ اس کے دل پہ ایک
داغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پڑ گیا۔ انمٹ!۔ زخمی!!

وہ مسکرائی۔ آسمان کے ہمسایہ سر بفلک پہاڑ کو دیکھا۔ پربت کے حسن کو دیکھ
کر وہ پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گئی۔ دل میں ایک درد اٹھا اور اپنے آپ کو بھول
گئی۔ اس نے برف کا روپ دھارا۔ اور نمناک ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر
دنیا کی نظروں سے بچتی ہوئی، ٹھنڈی ٹھنڈی کرنوں کی آڑ لے کر آکاش سے اتری
اور بے ساختہ اپنے موہن کے فراخ اور کشادہ سینے سے چمٹ کر بیتابیوں کو اپنے
دامن میں سمیٹنے لگی۔

کیوپڈ دیوتا نے ایک تیر اور مارا۔ برف نے اپنے پریتم کو سفید لبادہ میں چھپا
لیا۔ وہ بے چین ہو گئی۔ اس لئے کہ کوئی غاصب اس کے رفیق کو چھین کر اسے
جدائی کے تاریک اور عمیق غاروں میں نہ دھکیل دے۔

کچھ عرصے بوس و کنار میں مصروف رہنے کے بعد کٹھور اور ہرجائی عاشق
نے اپنی محبوبہ سے منہ پھیر لیا ہے۔ اور ایک لمبی سی چپ سادھ لی ہے نینوں
کے بان سے گھائل ہوئی ہوئی محبوبہ اپنے ساتھی کے سینے سے لپٹ لپٹ کر رو
رہی ہے۔ اس کو بیتی باتیں اور گزرے ہوئے حسین لمحے یاد دلا رہی ہے۔ اور
کہہ رہی ہے "میرے محبوب! بے وفائی اچھی نہیں" مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہو

رہا۔ کیونکہ ۔ پتھر کا دل بھی پتھر ہے ۔ سنگدل ۔

بجلیاں کوندرہی ہیں ۔ بادل گرج رہے ہیں ۔ اور گھنگھور گھٹائیں چڑیلوں کی سی بھیانک شکلیں اختیار کر کے ابھاگن کو ڈرا رہی ہیں خوف و دہشت کے مارے بادلوں کے کلیجے بھی پھٹ گئے ہیں ۔ لیکن وہ ۔ ایک نامعلوم اور اچھوتے جذبے کے تحت اپنے محبوب سے لپٹی جا رہی ہے ۔ اور میٹھا میٹھا سا درد پہلو میں دبائے' دیوانی ہو کر اس کا منہ چوم رہی ہے ۔ بجلیوں کا غضبناک ہو کر کڑکنا ۔ بادلوں کا طیش میں آکر گرجنا اور گھٹاؤں کا مہیب اور پرخوف شکلیں اختیار کرنا بھی اس کی پاک محبت میں رخنے پیدا نہیں کر رہا۔ بلکہ اس کی محبت بتدریج بڑھ رہی ہے ۔ نامعلوم کیوں ؟ بجلیاں کڑک کڑک کر ہار گئیں ۔ بادل گرج گرج کر تھک گئے اور گھٹائیں مقد طرب ہو کر روپوش ہو گئیں ۔ مگر وہ اسی طرح دامن تھامے بیٹھی رہی ۔ باوفا ۔

خاورِ مشرق اجلی کرنوں کا انمول تاج پہنے ، رات کی مست نیند کے بعد اپنی آرامگاہ سے آنکھیں ملتا ہوا نکلا ہے ۔ گوری گوری دوشیزہ کو دیکھ کر اس کے پاپی من میں ہل چل سی مچ گئی ہے ۔ اور سوئے ہوئے ارمان انگڑائیاں لے لے کر اس کے دھڑکتے ہوئے سینے میں بیدار ہو رہے ہیں ۔ وہ دھن کا پکا ہے پہلی ہی نظر میں' وہ حسن کی مے سے مدہوش ہو کر اپنا چمکتا ہوا محبت بھرا ہاتھ اس کی بھری بھری پیٹھ پر پھیر رہا ہے ۔ مرمریں جسم پر پھیر رہا ہے ۔ برف کے گورے چٹے بدن میں ہاتھ لگانے سے سوئیاں سی چبھنے لگی ہیں ۔ مگر وہ تلملا کر بھی اسے کورا جواب دے رہی ہے ۔ وفا پر قائم ہے ۔

مشرق کے دیوتا کی آنکھوں میں اس غیر متوقع شکست کی وجہ سے خون اتر آیا ہے ۔ دل میں خلش سی پیدا ہونے لگی ہے ۔ وہ خشمگیں نگاہوں سے بی برف

کو دیکھ رہا ہے۔ لیکن ایک محبوبہ ہے۔ جو اپنے بے وفا محبوب سے لگی ایک فرحت محسوس کر رہی ہے۔ وہ فرحت جس میں ایک جنت سی بستی ہے ۔۔۔ دیوانی ہے۔

ہوا کو شکست دینے والے بے خوف سورج کی نگاہوں میں اب اور بھی تیزی آگئی ہے۔ اور اس نے بڑھ کر اپنے نوکیلے ناخن نرم و گداز جسم میں پیوست کر دئے ہیں۔ نازک جسم پر جگہ جگہ کاری زخم لگے ہیں۔ اور ان میں سے خون رس رس کر بہہ رہا ہے سیمتن رو رہی ہے۔ چلا رہی ہے۔ اور فریاد کر کر کے اپنے ساجن کو جھنجھوڑتے ہوئے، اس کے رقیب اور اپنے دشمن سے آگاہ کر رہی ہے۔ مگر وہ بے ہوش پڑا ہے۔ بے پرواہ ہے۔

رقیب کی تیز اور خونخوار نگاہوں کی جلن کی تاب نہ لاکر، نیر بہاتی ہوئی سیم بر محبوبہ محبوب سے جدا ہونے لگی ہے۔ دوری کے ہولناک تصور سے وہ ہستی کو تباہ کر رہی ہے۔ یہ یاد کر رہی ہے۔ ابھاگن آنسوؤں کے دھارے میں بہہ کر سر سبز دلدلوں اور شاداب گھاٹیوں کو دکھڑا سنا رہی ہے۔ بے چین ہے اور ان کے قدموں سے لپٹ لپٹ کر چلا رہی ہے۔ "میرا بچھڑا ساتھی دلا دو!"

مگر کوئی اس کی پکار نہیں سن رہا۔ قسمت ہی روٹھ گئی ہے۔ لاتعداد تمنائیں پیوند زمین ہو چکی ہیں۔ اور ان گنت آرزوئیں سسکیاں لے رہی ہیں۔ وہ سر پر خاک ڈالی رہی ہے۔ اس نے پتھروں سے اپنا سر پھوڑ پھوڑ کر ندی کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ اور غم کی ماری گھل گئی ہے۔ با دلِ ناکام وہ حسرتوں سے جھولی بھرے، پھنکارتی ہوئی ناگن کی مانند ہموار میدانوں میں اتر آئی ہے۔ محبوب کی تلاش میں نکل پڑی ہے۔ یخ بستہ برف سے ندی ہو گئی ہے۔ لیکن سنگدل محبوب، کہاں ہے؟ کون اسے بتلائے؟

دُنیا ہے۔

ندی حیران و پریشان، تھکی تھکی سی، بچھڑے ہوئے ساتھی کی محبت کو سینے سے لگائے گھوم رہی ہے۔ مجنونِ صحرا کی طرح زمین کا سینہ ڈگمگاتے قدموں سے ماپ رہی ہے۔ مگر وائے ناکامی، بے انتہا کاوشوں کے بعد بھی اس بے وفا کا کہیں پتہ نہیں چل رہا۔

نامراد ندی نے سینے میں چٹکتے ہوئے شعلۂ محبت کی جلن اور سوزش کی تاب نہ لا کر سینے کو پھاڑ ڈالا ہے۔ دھجیاں اڑا دی ہیں۔ اور — اس کی محبت۔ نالوں کی شکل میں منقسم ہو کر اس بے وفا کو تلاش کرنے لگی ہے، جس نے یہ دن دکھایا ہے۔ عجیب حال کو پہنچایا ہے۔ ڈھونڈتی ڈھونڈتی وہ خشک اور بنجر کھیتوں میں جا نکلی — پاؤں میں چھالے، زبان پر کانٹے۔ اس نے وہیں تڑپ تڑپ کر سنگلاخ چٹانوں کا سا کلیجہ رکھنے والے کی یاد میں جان دے دی ہے۔ زمین میں سما گئی ہے۔

پاکیزہ محبت نے برف کا روپ دھارا۔ برف ختم ہو گئی۔ ایک وجود مٹ گیا۔ ندی نالے خشک ہو گئے۔ کتنے جسم فنا ہوئے؟ — مگر — !!! وہ فلکی محبت، آسمان کی کوکھ سے جنم لینے والی محبت، ہری ہری فصلوں کی شکل میں، بے رحم زمین کی چھاتی کو شق کر کے نمودار ہو گئی ہے۔ لہلہاتی ہوئی کھیتیاں، بے لوث محبت کی غمازی کرتی ہیں۔ اور سینۂ زمین پر نکھرا ہوا سبزہ کسی جواں مرگ کی خبر دے رہا ہے۔ رُتوں کا راجہ 'بسنت'، بھی سوگوار ہے۔

کیا محبت ختم ہو گئی — ؟ — نہیں۔ محبت نابود نہ ہوئی۔ وہ زندگیوں کا محور ہے۔ موت داسی ہے۔ وہ گگن سے اترنے والی دیوی۔ پھلوں، سبزیوں اور ترکاریوں کے

ڈھیروں میں، ہمارے سامنے برملا آ گئی ہے۔ ہم نے اسے اپنا لیا ہے۔ اس نے ہمیں بنا لیا ہے۔

محبت اپنی ہستی کو تباہ کر کے، ہم میں زندۂ جاوید ہو گئی ہے۔ اس کی پوجا انسان ہی نہیں، جن و ملائک اور وحش و طیور بھی کرتے ہیں۔ جب تک یہ باقی ہیں، ہم باقی ہیں۔ اور ہلکی ہلکی صبح میں کرنیں بکھیرتا ہوا سورج باقی ہے۔۔۔ محبت باقی ہے ——
محبت فانی نہیں۔ حوا کا مجازی خدا آدم لافانی ہے۔

حرفِ آخر
۱۵ اکتوبر ۵۴ء
موہنی روڈ۔ لاہور

"جنگلی" مصنّف آرزو چودھری

- دلچسپ ناول
- ایک رومان
- ایک عجیب داستان
- جس کا ایک ایک لفظ کئی حکایات پر بھاری ہے۔
- بار بار پڑھنے پر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔
- کئی سو صفحات پر مشتمل اور ٹائیٹل دیدہ زیب
- شائع ہونے کو ہے۔

ایک دو تین۔

ایک اور تفریحی ناول۔

مصنّف نے اچھوتے انداز میں

پیش کیا ہے۔

ضخیم اور سرورق قابلِ ستائش۔

۲۵۵

آرزو چودھری کا ایک نیا شاہکار

جنگلی

قیمت چار روپے (للعہ)

پرنٹرز و پبلشرز :- حاجی شیخ محمد ابراہیم کشمیر آرٹ پریس
...خیردین سٹریٹ پیسہ اخبار لاہور